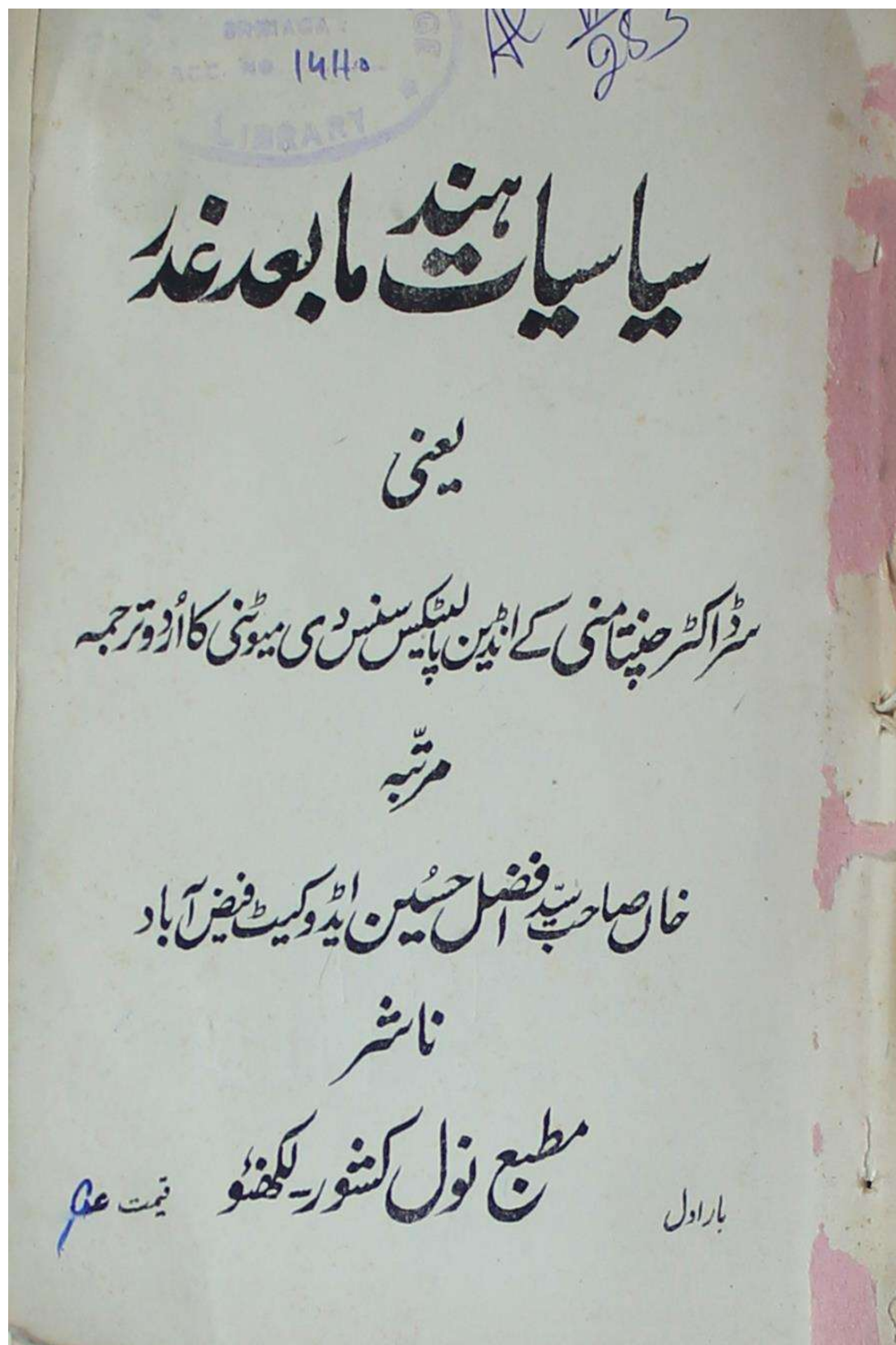


سیاسیات ہند مابعد غدر

یعنی

سر ڈاکٹر چنتامنی کے انڈین پالیٹکس سنس دی میوٹنی کا اردو ترجمہ

مرتبہ

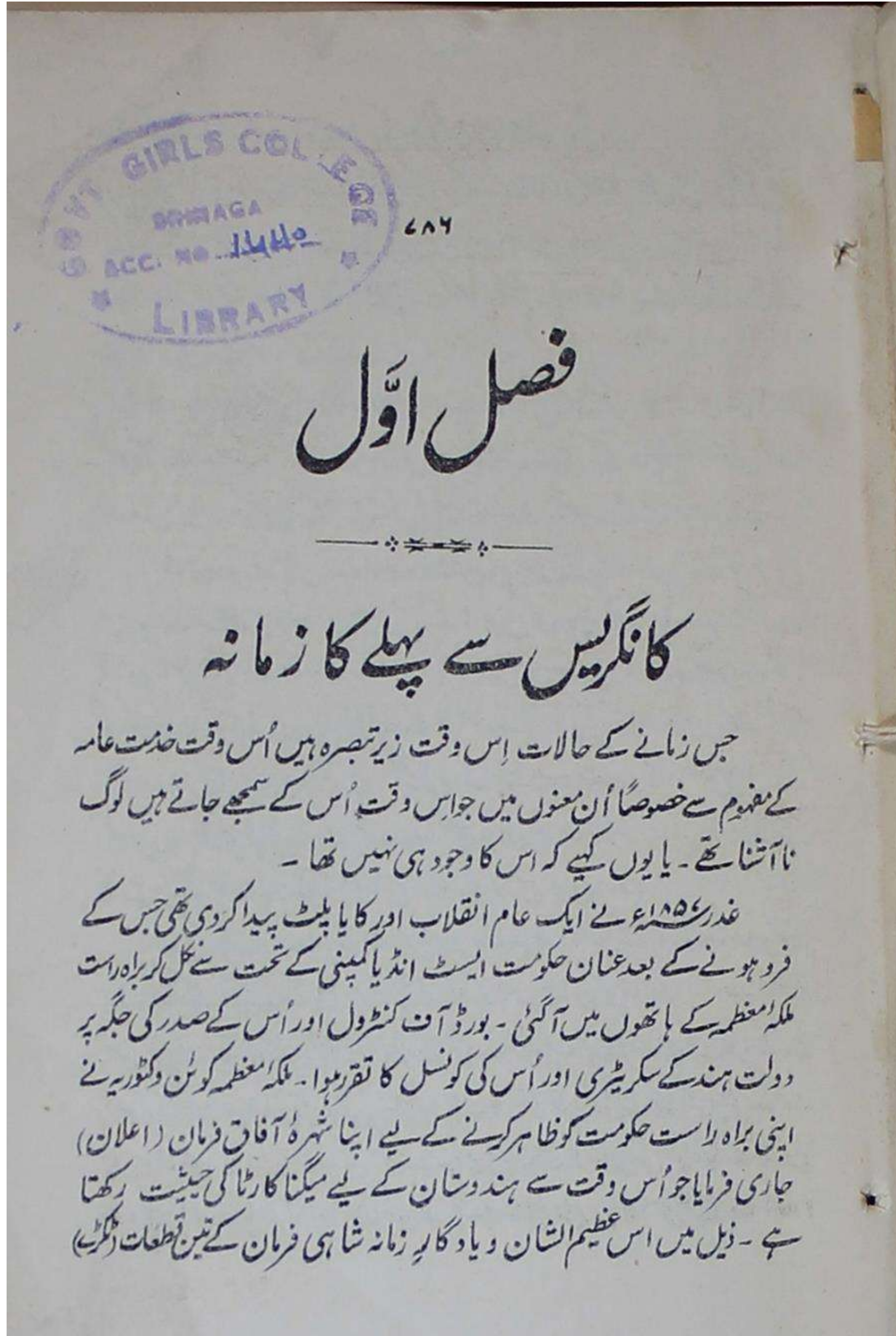
خان صاحب سید فضل حسین ایڈوکیٹ فیض آباد

ناشر

مطبع نول کشور۔ لکھنؤ

بار اول — قیمت عہ

فہرست مضامین سیاسیات ہند ما بعد غدر



فصل اوّل

کانگریس سے پہلے کا زمانہ

جس زمانے کے حالات اِس وقت زیر تبصرہ ہیں اُس وقت خدمت عامہ کے مفہوم سے خصوصاً اُن معنوں میں جو اِس وقت اُس کے سمجھے جاتے ہیں لوگ نا آشنا تھے۔ یا یوں کہیے کہ اس کا وجود ہی نہیں تھا۔

غدر ۱۸۵۷ء نے ایک عام انقلاب اور کایا پلٹ پیدا کردی تھی جس کے فرو ہونے کے بعد عنان حکومت ایسٹ انڈیا کمپنی کے تحت سے نکل کر براہ راست ملکہ معظمہ کے ہاتھوں میں آگئی۔ بورڈ آف کنٹرول اور اُس کے صدر کی جگہ پر دولت ہند کے سکریٹری اور اُس کی کونسل کا تقرر ہوا۔ ملکۂ معظمہ کوئن وکٹوریہ نے اپنی براہ راست حکومت کو ظاہر کرنے کے لیے اپنا شہرۂ آفاق فرمان (اعلان) جاری فرمایا جو اُس وقت سے ہندوستان کے لیے میگنا کارٹا کی حیثیت رکھتا ہے۔ ذیل میں اس عظیم الشان و یادگارِ زمانہ شاہی فرمان کے تین قطعات (ٹکڑے)

درج کیے جاتے ہیں جس سے اس کی ہر دلعزیزی ظاہر ہوگی۔

فرمان "ہم اپنے ہندوستانی قلمرو کے بسنے والوں کو فرائض کی اُسی کڑی میں منسلک متصور کرتے ہیں جن میں ہماری دوسری رعایا ہیں - اور اُن ذمہ داریوں کو خداوند قادرِ مطلق کے فضل اور مدد سے دل سے اور صمیم قلب سے ادا کریں گے۔

اور ہماری یہ بھی آرزو و خواہش ہے کہ جہاں تک ممکن ہو ہماری رعایا بلالحاظ کسی ذات مذہب و ملت کے آزادی اور غیر جنبہ داری کے ساتھ ملازمتوں اور عہدوں پر مامور ہو جس کے لیے اُس کی تعلیم قابلیت اور شخصیت اُسے مستحق بنا سکے۔

ہماری دلی خواہش ہے کہ ہندوستان کی سکون بخش صنعت وحرفت کو ترقی دی جائے اور فلاح عامہ اور ترقیوں کے کاموں کو مدد پہونچائی جائے اور سلطنت ہماری عام رعایا کے فائدے کے لیے جو اُس میں بستی ہے کی جائے - ہماری رعایا کی فلاحیت و بھلائی میں ہماری قوت کا راز مضمر ہے اُس کی قناعت میں ہمارا تحفظ ہے اور اس کا امتنان وتشکر ہمارا حقیقی انعام ہے - خداوند قادرِ مطلق ہمیں اور اُنھیں جو ہماری جانب سے ہمارے جانشین اور ہمارے ذمہ دار ہیں قوت بخشے کہ ہماری یہ تمنا ہماری رعایا کی بھلائی کے لیے پوری ہوتی رہے "

میری رائے ہے کہ ملکہ معظمہ وکٹوریہ کے پہلے وائسرائے لارڈ کیننگ نے جو ہمیشہ یاد کیے جائیں گے پہلی نومبر ۱۸۵۸ء کو اس فرمان کو نہایت مناسب مقام پر یعنی پریاگ کے شہر میں گنگا اور جمنا کے سنگم کے نزدیک ہندوستان کی رعایا کے لیے پڑھ کر سنایا اِس فرمان میں جن موقر جذبات کا لحاظ رکھا گیا تھا اگر اُسی کے تحت میں برطانیہ نے اس ملک کی سلطنت کی ہوتی تو ہندوستان کی سیاسیات کا رُخ دوسری جانب رہا ہوتا اور برطانیہ اور ہندوستانی رایوں کا اُسی طرح سے اتحاد و

اتفاق قائم رہا ہوتا جس طرح کہ گنگا اور جمنا میں یکجہتی اور میل قائم ہے اور اُسی کے ساتھ وفاداری اور وطن پرستی مرادف الفاظ متصور ہوتے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وائسرائے نے جن جذبات اور ارادوں کا اظہار فرمایا تھا کاش وہ واقعات میں مبدل ہوتے یعنی ہندوستان میں انگلستان کی طرح رائے عامہ ایک خود مختار و با اختیار گورنمنٹ کی حکمران ہوتی۔ ملکہ معظمہ نے خدا سے اپنے لئے اور اپنی گورنمنٹ کے لیے دعا مانگی کہ اُن اصولوں پر جن کا اظہار فرمان میں کیا گیا عمل پیرا ہونے کے لیے قوت عطا فرمائے۔ اگر صحیح مذہبی اسپرٹ (جذبات) پالیسی اور طریقوں پر برطانوی حکام عمل پیرا ہوئے ہوتے تو ہم اہل برطانیہ اہل ہند سے بہت پہلے یہ کہہ چکے ہوتے۔ "تمھارے ملک کی سلطنت تمھارا کام ہے نہ کہ ہمارا۔ ہم نے اپنے بھر سک تمھیں تمھارے ملک کی سلطنت کی ذمہ داریوں کو اختیار کرنے کے لیے تیار کر دیا اور اب ہم جاتے ہیں۔"

اس پر ہندوستان کا یہ جواب ہوتا "ہاں! مگر ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ تم ٹھہرو۔ نہ بحیثیت ہمارے مالکوں کے بلکہ ہمارے دوست کی حیثیت سے مساوات اور برابری کے ساتھ۔"

اس دنیا کا یہ ایک منحوس طریقہ ہے کہ سیاسیات میں اہل حکومت اکثر اور بیشتر خدا کو بھول کر سلطنت خلافِ اصول اور اخلاقی پہلو کے خلاف کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا ہے جیسا کہ افسوس کے ساتھ ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہندوستان اور برطانیہ میں کھنچاؤ اور اجنبیت پیدا ہے اور ہندستانیوں کو برطانوی تدبّر پر بہت کم اعتماد باقی رہ گیا ہے اور نیز آئینی طریقوں کو جو شعور اور عقل کے نزدیک ہمیشہ قابل پذیرائی ہیں ہندوستان کی آزادی حاصل کرنے کے لیے بہت سے لوگ ناکارہ اور غیر مفید تصور کرنے لگے ہیں۔

راجہ رام موہن رائے | جدید خدمت خلق کی زندگی کی بنیاد سب سے پہلے

راجہ رام موہن رائے کے ہاتھوں سے پڑی۔ انھوں نے مذہبی اصلاح کی تحریک کی قیادت کی اور برھمو سماج قائم کیا۔ انھوں نے ہندوستانی عورتوں کے معاملات کا بیڑہ اُٹھایا اور معاشرتی اصلاح کے رہبر و رہنما ہوئے۔ اور یہ اُن ہی کے بتائے ہوئے طریقے تھے جنھیں بنگالی علم ادب نے اختیار کیا اور اس کی وجہ سے آج اس قدر بارآور و شاداب ہے۔ انگریزی تعلیم کو ہندوستان میں رائج کرنے میں اُن کا بہت نمایاں ہاتھ تھا۔ اور وہ سب سے پیش پیش تھے۔ سیاسی اصلاحات کو انھوں نے نہیں چھوڑا اور دیوانی و فوجداری وفاتر و فرائض کی علٰحدگی کے لیے سب سے پہلے آواز بلند کی۔ اور وہی سب سے پہلے ہندوستانی ہیں جو پہلے پہل پارلیامنٹری کمیٹی کے سامنے شہادت دینے گئے۔ کہیں لارڈ مارلے نے خود کہا ہے کہ یہ ہندوستانی سیاسیات میں کوئی نیا سوال نہیں ہے۔ یہ بات لارڈ موصوف نے دیوانی و فوجداری محکمہ جات کی علٰحدگی کے متعلق کہی تھی۔ ایک صدی سے زائد راجہ رام موہن رائے کی وفات کو ہوچکے مگر اب تک کوئی اصلاح اس میں نہیں آئی۔

راجہ رام موہن رائے نے اپنی طویل خدمات کی فہرست میں ایک اخبار قائم کرکے مزید اضافہ کیا یہ سب سے پہلا اخبار تھا جو ایک ہندوستانی کی زیر ادارت شائع ہوا۔ جس زمانے میں راجہ صاحب موصوف بنگال میں یہ عظیم الشان خدمات انجام دے رہے تھے۔ اُسی زمانے میں نوروجی فریدوں جی مغربی صوبہ میں خدمات عامہ انجام دے رہے تھے۔ مسٹر نوروجی فریدوں جی کے لیے طغرائے امتیاز یہ امر بھی ہے کہ آپ دادا بھائی نوروجی کے مدرسہ میں استاد تھے جو ہندوستان کے سب سے بڑے محبِ وطن تھے۔ اور جس کو اہل ہند ان کی محبت و عظمت کا خیال کرتے ہوئے ہندوستان کے ضعیف اعظم ((Grand old man of India)) کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

دادا بھائی نوروجی

دادا بھائی نے اپنی سیاسی زندگی بیس۲۰ برس کی عمر سے شروع کی اور ۶۱ برس تک انتہائی یکسوئی و دلچسپی کے ساتھ اسی طرح صرف کیے۔ آپ ۱۸۲۵ء میں جب جارج چہارم برطانیہ کے بادشاہ تھے پیدا ہوئے۔ اور خلقت عامہ کی خدمت و بھلائی و بہبودی کے کاموں سے ۸۱ برس تک برابر کرتے رہے آپ کی وفات ۱۹۱۷ء میں ۹۲ برس کی عمر میں واقع ہوئی اور سچ تو یہ ہے کہ آپ کی وفات نہیں تھی بلکہ معلوم ہوا کہ ایک متحرک و مقناطیسی ادارہ بند ہوگیا۔ یوں تو خدمت عامہ کے زمرہ میں کام کرنے والوں کی ہمارے ملک میں ایک طویل فہرست ہے جس میں بہت بڑے طباع، ایثار پسند، اہلِ دل و اہلِ دماغ نظر آتے ہیں مگر یہ امر مسلمہ ہے کہ ہمارے زمانے میں دادا بھائی سے کوئی بڑھا نہیں۔ آپ نے ہندوستان و انگلینڈ میں کوئی تیس۳۰ ادارے قائم فرمائے جس میں سے بیشتر سیاسی تھے مگر ان میں سے بعض کے مقاصد معاشرتی اصلاح تھے۔ خصوصاً عورتوں کی آزادی اور ان کی تعلیم بھی تھی۔ آپ نے لڑکیوں کا پہلا اسکول اور پہلا اخبار قائم فرمایا اور کانگریس کی بنیاد ڈالنے والوں میں آپ کا مہتم بالشان حصہ ہے۔ مجھے آپ سے آپ کی پیرانہ سالی میں نیاز حاصل کرنے کا شرف نصیب ہوا۔

میں نے آپ سے زیادہ شریف طینت ہستی کوئی اور نہیں دیکھی آپ کی صورت سے جلال و عظمت ٹپکتی تھی اور اگر مسٹر لعل موہن گھوش کے الفاظ دُہرائے جاویں تو بیشک آپ کے اہل وطن کے دل میں آپ کی صورت دیکھ کر محبت، رشک و ناامیدی پیدا ہوتی تھی۔ محبت آپ کے کاموں سے، رشک اس لیے کہ کاش ہم بھی ایسے ہوتے اور ناامیدی، اس لیے کہ آپ کے بعد آپ ایسی ہستی کا ہونا محال ہے۔ مسٹر گوکھلے کا ارشاد ہے "اگر ملکوتیت کبھی جامۂ انسانی میں نظر آسکتی ہے تو بیشک وہ دادا بھائی کے کالبد میں جلوہ افروز ہے"۔

پہلے سیاسی کارکن جنھوں نے کارِ نمایاں کیے وہ صوبۂ مدراس میں مسٹر گدولہ لکشمی نرسم ہولوجی تھے آپ نے مدراس میں نیو ایسوسی ایشن اور کریسنٹ اخبار قائم کیے۔

دوسرے محب وطن

دوسرے محب وطن جن کے اسمار گرامی قابل ذکر ہیں اور جنھوں نے کانگریس سے پہلے ملک کی خدمات انجام دیں اور کافی شہرت حاصل کی اور (All India Leader) آل انڈیا لیڈر کہے گئے اُن میں خاص طور پر مہادیو گووند راناڈے۔ بدرالدین طیب جی۔ فیروزشاہ مروان جی مہتا۔ کاشی ناتھ ترمبک تیلنگ۔ ڈنشا ایڈلجی واچا۔ جھومری لال اومے شنکر دسکک۔ رحمت اللہ محمد سیانی۔ نرائن گنیش چندر ورکر اور بال گنگا دھر تلک صوبہ بمبئی میں۔ ڈبلو۔سی بنرجی۔ من موہن گھوش۔ سریندر ناتھ بنرجی۔ لال موہن گھوش۔ انند موہن بوس اور کالی چرن بنرجی بنگال میں۔ ایس او رجی سبرا اینا ایر۔ انند چار۔ سالم رانا سوامی بدلو سار اور سی وجے راگھو اچاریہ صوبہ مدراس میں ہیں۔ اور پنڈت مدن موہن مالویہ صوبہ متحدہ میں قابل ذکر ہیں۔

برٹش انڈین ایسوسی ایشن کلکتہ

سب سے پہلی جو انجمن قائم ہوئی وہ برٹش انڈین ایسوسی ایشن کلکتہ ہے۔ یہ انجمن زمینداران بنگال اور بہار و اُڑیسہ کی تھی۔ اُس پُرانے زمانے میں جس کی سیاسیات کے بارے میں اس وقت ذکر کر رہا ہوں یہی انجمن سیاسی جدوجہد میں آگے آگے تھی۔ یہی انجمن ہے جس کے تحت میں بنگال کے متعدد مشہور آدمیوں نے پبلک کام کر کے شہرتیں حاصل کیں۔ جن میں سے ہریشچندر مکرجی جو اس انجمن کے اخبار ہندو پیٹریٹ کے اڈیٹر تھے۔ کرسٹو داس پال جو اسی اخبار کے ان کے بعد اڈیٹر ہوئے اور مشہور مقرر رام گوپال گھوش راجہ دگمبر متر مہاراجہ رام ناتھ اور مہاراجہ سر جتیندر موہن ٹیگور مہاراجہ بہادر سر نریندرا کرشن راجہ راجیندر نرائن دیب بہادر

اور راجہ راجندر لال متر ہیں - ایک نہایت معروف و مشہور خدمت خلق کرنے والی ہستی صوبہ بنگال میں - اسی زمانے میں ریورنڈ کے - ایم بنرجی کی ہوئی ہے جو غالباً ہندوستانی عیسائیوں میں سب سے پہلے اور سب سے زیادہ گرمجوشی کے ساتھ قومی تحریکوں میں حصہ لیتے رہے - چونکہ برٹش انڈین ایسوسی ایشن طبقہ زمیندار کی انجمن تھی اس جہت سے ایسی دوسری انجمن کی ضرورت محسوس ہوئی جو زیادہ عام لوگوں کو اپنے دامن میں لے سکے - اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے بابو سسر کمار گھوش نے جنھوں نے امرت بازار پتر کا قائم کیا اور اس کے پہلے اڈیٹر خود ہوئے - دوسری انجمن کی بنیاد ڈالی آپ کی شہرت، آپ کی روحانیت اور آپ کی خدمت خلق زبان زد خلائق ہے - اس انجمن کو انڈین ایسوسی ایشن نے دبا دیا اور یہ انجمن اب تک موجود ہے اس کی بنیاد سریندر ناتھ بنرجی اور انند موہن بوس نے رکھی -

بمبئی پریسیڈنسی ایسوسی ایشن

اسی جوڑ کی صوبہ بمبئی میں "بمبئی ایسوسی ایشن" قائم ہوئی جس کے روح رواں مشہور مقنن وشنا تھ نارائن منڈلک تھے اس کی بنیاد پر چند دنوں بعد بمبئی پریسیڈنسی ایسوسی ایشن قائم ہوئی جس کے ساتھ ہمیشہ سر فیروز شاہ و سر ڈنشا واچا کا نام لینا ضروری سمجھا جاوے گا - باوجودیکہ صوبہ بمبئی میں "پونا" ایک معمولی شہر ہے مگر اس نے اپنی عظمت کو جو اُسے قدیم مرہٹہ دارالحکومت کی وجہ سے حاصل تھی قائم رکھا اور سروا جنک سبھا یہیں قائم ہوئی جس کے مددگار، رہبر اور فلسفی مہادیو گوبند رانا ڈے رہے اور اس انجمن نے سالہا سال تک بہت سے قومی فریضے انجام دیے - اس کے ممبروں میں سیاسی آرا کا کچھ دنوں بعد اختلاف پیدا ہوا اس لیے مسٹر رانا ڈے کی سرکردگی میں دکن سبھا قائم ہوئی - پہلا فخر سروا جنک سبھا کو اور دوسرا دکن سبھا کو حاصل ہے کہ مسٹر گوکھلے ان کے سکریٹری کئی برس تک رہے - اول الذکر کا سہ ماہی رسالہ

جس میں مسٹر راناڈے زیادہ لکھتے تھے اپنی قسم کا پہلا اور آخری رسالہ تھا۔ اس کا ہر صفحہ اطلاعات و معلومات کا مخزن تھا۔ صوبہ مدراس میں نیو ایسوسی ایشن کی جگہ جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے مہاجن سبھا قائم ہوئی۔

صحافتی سرگرمیاں

اسی زمانے میں اہل ہند نے صحافتی میدان میں سرگرمیاں شروع کیں۔ علاوہ ہندو پیٹریٹ کے جس کا ذکر اوپر آچکا ہے "امرت بازار پتر کا" انڈین مرر۔ بنگالی۔ "رئیس و رعیت" بنگال میں جاری ہوئے۔ انڈین مرر کے قائم کرنے والوں میں شہرۂ آفاق شخص کیشب چندر سین بھی تھے اس کے پہلے اڈیٹر مسٹر من موہن گھوش تھے۔ تھوڑے دنوں بعد اس کے اڈیٹر مسٹر نریندر ناتھ سین ہوئے جنھوں نے عظیم الشان خدمات عرصہ تک انجام دیں۔ 'پترکا' کے اڈیٹر بابو سیسر کمار گھوش کے بعد ان کے چھوٹے بھائی بابو موتی لال گھوش ہوئے اور ورناکلر پریس ایکٹ کی گرفت سے بچنے کے لیے یہ اخبار بنگالی زبان سے انگریزی میں کر دیا گیا۔ مسٹر ڈبلو۔ سی۔ بنرجی سے سور ندر ناتھ بنرجی نے بنگالی لے لیا۔ یہ سن کر کہ پترکا پہلا مطبع ۳۲ روپئے کو فروخت ہوا اور بنگالی مطبع کے صرف موجودہ مالکوں نے ۲۵ روپیہ دیے آج کل کے بہتیرے صحافت نگاروں کے منہ میں پانی بھر آئے گا۔ بمبئی میں مسٹر دادا بھائی نوروجی نے "وائس آف انڈیا اخبار" اور مسٹر منڈلک نے نیٹو اپینین اخبار جاری کیے۔ انڈین اسپکٹیٹر مسٹر مالا باری کا اخبار تھا۔ اس وقت اور اس کے بہت دنوں بعد تک مسٹر (اب سر) ڈنشا واچا مختلف اخبارات میں برابر مضامین لکھتے رہے۔ "ہندو پرکاش" کی عنان پہلے مسٹر تلنگ اور اس کے بعد مسٹر (اب سر) نرائن چندر ورکر کے ہاتھوں رہی۔ "کیسری" پہلے مسٹر اگرکار کی اس کے بعد مسٹر تلک کی ادارت میں نکلتا رہا۔ مسٹر تلک ہفتہ وار انگریزی پرچہ مرہٹہ کے بھی

مدیر تھے مگر سب سے زیادہ قابل ذکر جس کا تعلق اس زمانے کی صحافت نگاری سے ہوسکتا ہے وہ "ہندو" کا اجرا ہے۔ اس کے سب سے پہلے اور مہتم بالشان اڈیٹر مسٹر جی سبرامینا ایر کا نام جب تک صحافت نگاری قائم ہے زندہ رہے گا۔ الٰہ آباد میں پنڈت اجودھیا ناتھ نے "انڈین ہرالڈ" جاری کیا مگر یہ تین برس زندہ رہ کر اور تقریباً ایک لاکھ کا گھاٹا دے کر بند ہوگیا۔ پنجاب کو سردار دیال سنگھ مجیٹھا نے ٹریبون عطا کیا۔

یونیورسٹیوں کا قیام

ملکہ وکٹوریہ کی سلطنت کے قیام کے بعد پہلا کام جو گورنمنٹ نے ملک کی ترقی کے لیے کیا ہے وہ کلکتہ۔ بمبئی اور مدراس یونیورسٹیوں کا قیام ہے۔ یہ ایک نہایت مدبرانہ، دلیرانہ فعل تھا۔ چونکہ غدر کے بعد اس کا وقوع ہوا اس کے معنی نہایت معنی خیز ہمت آفریں تھے۔ جن سے اُس پاکیزہ جذبہ کا اظہار حرف بحرف ہو رہا تھا جو برطانیہ نے ہندوستان کیلئے کئے تھے۔ اسی کے جوڑ کی ایک بات اور ہے جو لارڈ کچنر نے سوڈان کے فتح کے بعد ۱۸۹۸ء میں خرطوم کے مقام پر گارڈن میموریل کالج کھول کر کی ہے یہ برطانیہ کا ایک انداز ہے۔ اس کی جھلک ایک مکالمہ میں جو مانٹ اسٹوارٹ الفنسٹن گورنر بمبئی اور لفٹنٹ جنرل برگس جو مرہٹہ ہنگامہ کے وقت کے درمیان ہوا ہے پائی جائے گی۔

"ایک دن میں نے ان کے خیمہ کے ایک کونہ میں چھپی ہوئی مرہٹی کتابوں کا ایک انبار لگا ہوا دیکھا تو میں نے ان سے دریافت کیا۔ یہ کس غرض سے رکھی ہیں؟ گورنر نے جواب دیا۔ یہاں کے باشندوں کو تعلیم دینے کی غرض سے۔ ہاں اس کے ساتھ ہی ہمیں یورپ واپس بھی کریگا۔ میں نے کہا۔ تو آپ بمبئی کے گورنر ہو کر ایسی چیز شروع کرتے ہیں (جس میں نقصان ظاہر ہے)۔ گورنر نے جواب دیا۔ بہرحالت و صورت ہمارا یہی فرض ہے اور مکالے نے بھی کہا ہے کہ "فریضہ کا یہی راستہ

فراست و قومی ترقی اور قومی عظمت و عزت کا راستہ ہے"۔

انڈین کاونسل ایکٹ ۱۸۶۱ء

تین برس بعد انڈین کاونسل ایکٹ ۱۸۶۱ء پاس ہو کر نافذ ہوا۔ گورنر جنرل کی مجلس مقننہ غدر سے چند سال پیشتر قائم ہو چکی تھی مگر اس کی ممبری صرف حکام تک محدود تھی اور یہ کس قدر تعجب انگیز بات ہے کہ چیف جسٹس بھی اس کا ایک فرد تھا۔ ایکٹ ۱۸۶۱ء کی رو سے چند غیر سرکاری اشخاص نامزدگی کے ذریعہ سے ممبر ہو سکتے تھے چنانچہ اسیطرح کی تین صوبوں میں کاونسلیں قائم ہوئیں۔ لارڈ میو کی وائسرائلٹی کے زمانے سے لوکل سلف گورنمنٹ اور صوبہ جاتی مالیات کی علیٰحدگی کا سنگ بنیاد پڑا مگر ۱۸۷۰ء میں تعزیرات ہند میں ایک نئی دفعہ ۱۲۴ الف کا اضافہ ہوا جس کے تحت میں بغاوت، کی سزا مقرر ہوئی اور لارڈ لٹن کے زمانے میں ورنا کلر پریس ایکٹ (قانون مطابع دیسی زبان) و قانون اسلحہ کا نفاذ ہوا۔ ورنا کلر پریس ایکٹ کو تو ان کے جانشین (لارڈ رپن) نے منسوخ کر دیا مگر قانون اسلحہ اب تک اسی طرح موجود ہے البتہ اس میں قواعد کی رو سے جو وقتاً فوقتاً بدلتے رہے تھوڑی بہت تبدیلیاں پیدا ہو گئی ہیں ۶ برس یعنی ۱۸۷۴ء سے ۱۸۸۰ء تک کا زمانہ ایک عجیب ترقی معکوس کا زمانہ گذرا ہے جس میں دوسری افغان جنگ بے سوچے سمجھے اختیار کی گئی اور جس میں ہندوستانی ٹکس دہندگان کی جیب سے ایک کثیر رقم صرف ہوئی ہاں یہ ضرور ہوا کہ مسٹر گلیڈ سٹون کے اشارے پر ۵ ملین پونڈ برطانوی خزانے کا بھی اس میں صرف ہوا۔

انڈین سول سروس

اسی زمانہ میں سول سروس کے قواعد میں وہ تبدیلیاں عائد کی گئیں جو اہل ہند کے مفاد کے خلاف تھیں۔ جب مقابلہ کے ذریعہ سے بھرتی ہونا بند کر کے ہیلی بری طریقہ پر اس ملازمت میں بھرتی کی جانے لگی تو مسٹر جان برائٹ نے جو ہندوستان کے ایک سچے ہمدرد تھے۔

Siyasiyaat_e_hind_ma_baad-e-ghadar

اس پر سخت نکتہ چینیاں کیں اور یہ بتایا کہ یہ طریقہ ہندوستانیوں کو ان کے ملک کی منصب داری (ملازمت) کے لیے کس قدر کم ذرائع دے رہا ہے۔ جب اس کے جواب میں یہ کہا گیا کہ کسی قوم کو علیحدہ نہیں کیا گیا ہے تو مسٹر جان برائٹ نے یہ فرمایا کہ انگریز و ہندوستانی کے لیے ایک سے قواعد ہونے چاہئیں اور صرف ہندوستانی امیدوار کے لیے کیوں ۵ فٹ ۲ انچ ضروری ہے! امتحان کا انگلینڈ میں ہونا ہی اس امر پر دلالت کرتا تھا کہ جو برابری اور مساوات کے وہ وعدے جو دفعہ ۸۰ چارٹر ایکٹ ۱۸۳۳ء میں و نیز فرمان ۱۸۵۸ء میں ایک طرح کے موقع و سہولتوں کے کئے گئے تھے ہندوستانیوں کو میسر نہیں ہو رہے ہیں۔ چارٹر ایکٹ ۱۸۳۳ء کو جب ڈائرکٹران ایسٹ انڈیا کمپنی نے گورنر جنرل کے پاس روانہ کیا تھا تو اس میں اسکی تصریح کی تھی کہ آئندہ سے کوئی سلطنت کرنے والی ذات نہ متصور ہوگی۔ مگر افسوس ہے کہ انسانی اُمیدیں کس قدر بہانہ باز اور کس قدر شعبدہ باز ہیں۔ دادا بھائی نوروجی کی جی توڑ مخالفت کا یہ نتیجہ ہوا کہ ۱۸۷۰ء میں ایک ایکٹ پاس ہوا جس کی رو سے ہندوستانی امیدواروں کی ایک محدود تعداد نامزدگیوں کے ذریعہ سے انڈین سول سروس میں لی جاسکے۔ اس ایکٹ کے تحت میں جو قواعد مرتب ہوئے وہ تو ۱۸۷۹ء میں جاکر بنے اور حقیقت تو یہ ہے کہ بہت کم ہندوستانی امیدوار لیے جاسکے۔ ۱۸۸۶-۸۸ء کے پبلک سروش کمیشن نے اس سول سروس کو منسوخ و مسترد کردیا اور اس کی جگہ پر صوبجاتی سول سروس جاری ہوئی۔ ان تمام دقتوں کے ہوتے ہوئے جو ولایت میں امتحان ہونے میں پیدا ہوئیں چند ہندوستانی امیدوار بھی سول سروس میں داخل ہوگئے اور پہلے پہل لیے جانے والوں میں ستیندر ناتھ ٹیگور جو ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور کے بھائی تھے لیے گئے۔ بعد میں مسٹر آر۔ سی دت۔ سرندر ناتھ بنرجی و سر کے۔ سی گپتا بھی لیے گئے اور ناکام ہونے والوں میں مسٹر من موہن گھوش تھے

کامیاب ہندوستانی امیدواروں کی اس قلیل تعداد نے بھی برطانوی گورنمنٹ کو باوجود اس کے دعوہائے بلند از قومیت و رنگ و بو و مساوات اس قدر بدحواس کر دیا کہ شریک ہونے والوں کی عمریں ۲۳ سے ۱۹ مقرر کر دی گئیں جس سے ہندوستانیوں کا شریک ہونا محال ہو گیا۔ لارڈ لٹن نے ایک سرکاری مراسلہ میں سکریٹری ہند کو یوں لکھا۔ "ہم نے جو سنانے کے لیے امیدیں دلائی تھیں اس کا خاتمہ کر دیا۔ اور یہ طریقہ نہایت ہی غیر مستقیم و غیر مناسب ہے" ورناکلر پریس ایکٹ و آئی سی ایس کے امیدواروں کی عمر کی کمی نے مسٹر لال موہن گھوش کو انڈین ایسوسی ایشن کی جانب سے ولایت جانے کے لیے منتخب کیا کہ آپ وہاں جا کر ان دو باتوں کے بارے میں احتجاج کریں۔ مسٹر لال موہن گھوش جس وقت انگلینڈ گئے ان کی عمر صرف ۳۰ سال کی تھی اور سب سے پہلی میٹنگ جس میں آپ نے تقریر کی وہ ولیز روم میں منعقد ہوئی جس کے صدر مسٹر جان برائٹ تھے۔ اس ۳۰ برس کے ناتجربہ کار نوجوان نے جو معرکۃ الآرا تقریر اس موقع پر کی اس کے متعلق مسٹر جان برائٹ کے الفاظ قابل غور ہیں "میں اپنے بے جوڑ و غیر موثر الفاظ سے اس شاندار تقریر کے اثر کو زائل نہیں کرنا چاہتا" جان برائٹ کے متعلق تو یہ مسلم ہے کہ گلیڈ سٹون کو چھوڑ کر وہ برطانیہ کے سب سے بڑے مقرر تھے اور گلیڈ سٹون کے انداز تقریر کے بارے میں لارڈ روز بری کا یہ مشہور مقولہ ہے کہ "وہ بہتے ہوئے دریا کا ایک شاندار بہاؤ تھا"۔ مسٹر لال موہن گھوش مسٹر جان برائٹ کی وساطت سے مسٹر گلیڈ سٹون سے ملے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دارالعوام میں ایک مباحثہ ہوا جس میں خود مسٹر گلیڈ سٹون نے حصہ لیا اور یہ کہا کہ ورناکلر پریس ایکٹ خود گورنمنٹ کے لیے باعث توہین ہے اور جب خود مسٹر گلیڈ سٹون وزیر اعظم اور لارڈ رپن وائسرائے ہوئے تو یہ ایکٹ مسترد و منسوخ کر دیا گیا۔ تھوڑے دنوں بعد آئی۔سی۔ایس کے داخلہ کے لیے

عمر بھی بڑھا دی گئی -

مسٹر لال موہن گھوش نے اپنی سحر بیانی کا وہ سکہ برطانوی سامعین پر بٹھا رکھا تھا کہ انھیں (Bronzed) برانزڈ مقرر کے نام سے یاد کیا جاتا تھا - ان کے تقریر کرنے کے اعلان پر بہت بڑا مجمع ہوا کرتا - لارڈ روز بری اور جارج چیمبر لین ایسے اشخاص سے انھوں نے خراج تحسین حاصل کیا اور دو بار ان کی نامزدگی بحیثیت لبرل امیدوار کے پارلیمنٹ کے لیے عمل میں آئی - اگرچہ وہ کامیاب نہ ہو سکے مگر انھوں نے آیندہ کے لیے دادا بھائی نوروجی کے لیے راستہ صاف کر دیا - آخر زمانۂ حیات میں لال موہن گھوش نے سیاسیات میں کوئی نمایاں حصہ نہیں لیا - مدراس کانگریس میں محض اپنا خطبۂ صدارت دینے کے بعد وہ ۱۹۰۳ء میں کلکتہ میں کانگریس میں شریک ہوئے یہ ایک امر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ انھوں نے اپنے معنی خیز خطبہ میں لارڈ کرزن کے دربار کے بارے میں جو اس سال کے شروع میں ہوا تھا" "ایک فاقہ کش بلا نصیب قوم کے لیے دکھاوے کا جلوس" کے الفاظ سے یاد کیا - وہ آخری بار ۱۹۰۶ء میں کانگریس پلیٹ فارم پر نظر آئے جس میں صدر کانگریس دادا بھائی نوروجی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے آپ نے نہایت معنی خیز و بلیغ تقریر فرمائی اور نیز آئینی جدوجہد کی موافقت میں وہ زبردست و معرکۃ الآرا تقریر فرمائی جس سے آئینی جدوجہد کے خلاف جو نیا گروہ پیدا ہو گیا تھا خاموش ہو گیا - ان تمام مقررین کو سن کر جس کے سننے کا مجھے شرف حاصل ہوا ہے میں بلا تامل یہ کہہ سکتا ہوں کہ مسٹر لال موہن گھوش اور مسز بسنٹ کو اس صف میں سب سے پہلی جگہ حاصل تھی اور آپ کو ہندی جان برائٹ کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا -

لارڈ رپن

انگلینڈ میں لبرل پارٹی کے با اختیار ہوتے ہی ہندوستانی سیاسیات میں ایک ترقی کن انقلاب پیدا ہو گیا اگر میں ان نوجوانوں سے

جو سیاسیات ہند کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں۔ یہاں یہ کہوں کہ اس کا مطالعہ اُس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا تاوقتیکہ وہ اُسے زمانے و سائنس کے لحاظ سے ہندستان و انگلینڈ کے حالات کے لحاظ سے دونوں کا مطالعہ نہ کریں تو بے جا نہیں ہے۔ اس مضمون پر میں مسٹر آر۔سی۔دت کی ایک مختصر تصنیف " انگلینڈ و ہندوستان ۱۷۸۵ء۔ ۱۸۸۵ء کو پڑھنے کی ہدایت کروں گا۔ اس کتاب میں مسٹر دت نے ہندوستان اور انگلینڈ کے سیاسیات کا تقابل کرکے دکھایا ہے اور معلوم ہوتا ہے جیسے سیاسیات کے دو دھارے جاری ہیں۔

لارڈ لٹن کے بعد لارڈ رپن وائسرائے ہوئے جنھیں بلاشبہ بہترین خصائل کا وائسرائے کہا جاسکتا ہے۔ حقیقتاً یہ بہت برگزیدہ نفس شخص تھے اور سیاسیات میں کبھی ہتھکنڈوں و خفیہ ترکیبوں سے آپ نے کام نہیں لیا اور آپ کے پیش نظر ہمہ وقت برک کا مشہور مقولہ رہا " جو بات اخلاقی نقطۂ نظر سے بُری و غلط ہے سیاسی طور پر بھی صحیح نہیں ہو سکتی"۔ آپ ہمیشہ اسی پر عمل پیرا رہے۔ آپ نے اپنی صرف چار برس کی قلیل دور حکومت میں جو کچھ کیا زیادہ نہ ہوتا ہم جو کچھ لکھا گیا وہ اس مستحسن ارادے و پاک جذبات کا لحاظ کرتے ہوئے جو اس پاک باطن و علوی نفس وائسرائے کے دل میں موجزن تھے بہت کم اور نامناسب ہے۔ آپ کو جن دقتوں کا سامنا کرنا پڑا ہے انھیں یاد رکھنا چاہیے۔ آپ نے لوکل سلف گورنمنٹ کی خشت اول رکھی جسے ہم آج ایک حقیر بات خیال کریں گے مگر اس زمانے میں یہی بڑی بات و مشکل شے تھی۔ ہر ہر قدم پر حکومت کرنے والے (Beauracracy) مقاومت مجہول کے روڑے اٹکائے اور ان کی مقاومت مجہول اس قدر زبردست تھی کہ شاید مہاتما گاندھی بھی اس بات میں ان کے چیلے معلوم ہوں۔ جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے میں یہ کہوں گا کہ اصلاحات کو تباہ و برباد کرنے میں

جس قدر مستقل حکام کا یہ فرقہ مشاق ہے کوئی اور گروہ نہیں نظر پڑتا۔

لارڈ رپن کو ضابطہ فوجداری سے ان نام نہاد دفعات کے نکالنے میں جو قومیت و رنگت کے فرق کا خیال کرکے لکھی گئی ہیں جن مصائب و دقتوں سے دوچار ہونا پڑا ہے اس کا اندازہ یوں کیا جا سکتا ہے کہ آپ کے اہل وطن نے جو ہندوستان میں تھے انتہائی مخاصمت و مخالفت پر کمر باندھ رکھی تھی دوسری جانب خود سکریٹری ہند کی جانب سے کوئی کافی مدد نہیں ملتی تھی۔ اس تحریک کو البرٹ بل کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اس لیے کہ اس وقت قانون کے ممبر البرٹ تھے۔ یہ ضرور ہے کہ لارڈ رپن نے ہندیوں کے من موہ لیے تھے وہ ان کے محب صادق تھے مگر ساتھ ہی ساتھ آپ کے ہموطنوں نے اپنے کینے حملہ کا نشانہ بنا رکھا تھا اور وہ اپنی مدت ختم ہونے سے ایک سال قبل بے بس ہوکر واپس چلے گئے ان کا دوران حکومت ہندی اور اُن برطانوی باشندوں کے لیے جو اس ملک میں چند دنوں کے لیے قیام پذیر ہوتے ہیں ان کی مختلف زاویہ نظر ان کے اغراض و مقاصد جو متضاد ہوتے ہیں ان کی ایک تمثیل ہے یہ وہی بات ہے جسے پہلے (Burk) برک نے بھرپور ملنے محسوس کیا۔ لارڈ رپن سے پہلے سر جان (لارڈ) لارنس نے اسی پر اظہار افسوس بھی کیا تھا اور ان کے الفاظ یہ تھے "ہندوستان کی سلطنت کو خوش اسلوبی اور نیک نیتی سے چلانے میں بے حد دقتیں ہیں۔ ہندی باشندوں کی فلاح و بہبودی کے لیے اگر کچھ کہا جاتا ہے یا کوئی کوشش کی جاتی ہے تو ایک ایسی چیخ پکار مچ جاتی ہے کہ اُس کی گونج انگلینڈ میں بھی سنائی دیتی ہے اور اس آواز پر لبیک اور تعاون کے نعرے بلند ہوتے ہیں بعض اوقات تو میں گھبرا جاتا ہوں اور کچھ بنائے بن نہیں پڑتی۔ یوں کہنے کو تو انصاف، اعتدال اور بہت سی اچھی باتیں ہیں مگر جب ان اصولوں پر عمل کیا جاتا ہے

اور اس سے کسی کو کچھ ٹھیس لگتی ہے اور کچھ نقصان پہونچتا ہے تو بس نہ پوچھیے کہ کیا سے کیا ہو جاتا ہے" (ماخوذ از خط بنام سر ارسکن بیری ممبر انڈیا کاونسل)۔

لارڈ لٹن کے رجعت پسند زمانے نے ہندی محبان وطن کو یک گونہ مایوس کر دیا تھا اور وہ اپنی مایوسی میں گھبرا کر قومی خدمت کے کاموں سے برطرف ہوئے تھے یہاں تک کہ قائد محبان وطن خود دادا بھائی نوروجی نے بھی جن کے دل میں امید و ترقی کی شمع ہمیشہ روشن تھی سیاسی سرگرمیوں سے برطرف ہونا چاہا اور اسی زمانے میں وہ بڑودہ میں دیوان بھی ہو گئے تھے مگر صرف ایک سال کے بعد اُسے چھوڑ دیا۔

اگر کبھی یہ سوال کیا جاوے کہ لارڈ لٹن اور لارڈ کرزن میں سے کون سب سے مدبّر والسرائے تھا تو غالباً اس کا صحیح اندازہ محال ہے۔ لارڈ رپن کے دور حکومت کے شروع ہوتے ہی سیاسی سرگرمیوں کی ایک تیز و تند لہر دوڑ گئی اور اگر خارجی واقعات کو نظر انداز کر کے دیکھا جاوے تو کانگریس کی بنیاد جو ان کے جانے کے ایک سال بعد قائم ہوئی ان کی تخریب ابتر عہد حکومت کی ایک زندہ یادگار ہے۔

سیاسیات زمانہ کی حالت

اب یہاں پہونچکر ہمیں اس زمانے کی سیاسیات و خدمات خلق کی سرگرمیوں کا جائزہ لینا چاہیے یعنی غدر کے بعد اور کانگریس کے قیام کے درمیان کے حالات پر ایک نظر ڈالنی چاہیے۔ چونکہ ہندوستان میں کوئی منظم جماعت رائے عامہ کے اظہار و احتجاج کے لیے نہیں تھی اس لیے جو کچھ بھی ہوا وہ سب برطانوی وزارت و برطانوی پارلیمنٹ کے وقتی تبدیلیوں اور ان کی پالیسیوں کے مظاہرے تھے جو کچھ بھی ہوا وہ انھیں دونوں کے رحم و کرم انھیں کے غضب و غصہ انھیں کے احساس عدل و انصاف کا ایک مقیاس اتار و چڑھاؤ تھا کبھی ہندی کو

ترقی دینے کی دھیمی آواز آتے سنائی دی اور کبھی اس کے برعکس نظر آیا۔ وائسرایوں میں سے کچھ اچھے اور کچھ زیادہ اچھے ہوئے جو سلسلہ کیننگ کے نام سے شروع ہو کر رپن پر ختم ہوتا ہے وہاں لارنس۔ میو اور نارتھ بروک کو بھی نہ بھولنا چاہیے۔

مگر ساتھ ہی ساتھ لارڈ لٹن کو بھی یاد رکھنا چاہیے جنھوں نے اپنے سے پہلے آنیوالوں کے کارناموں کو ملیا میٹ کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ اگر غدر کے بعد سب سے بڑا تعمیری کام یونیورسٹیوں کا قیام تھا تو دوسری طرف دیوانی اور فوجداری کو ایک میں شامل کرنا جو گذشتہ زمانے میں علیحدہ تھیں۔ ورنا کیولر پریس ایکٹ کا نفاذ اور سرحدی پالیسی کا اختیار کیا جانا جس میں ہندوستان کے ایک کثیر سرمایہ کا اسراف شامل تھا قانون اسلحہ و نیز ہندوستانیوں کو اونچی منصب داریوں میں عمر کم کر کے شریک ہونے سے باز رکھنا تخریبی کام بھی تھے۔ صرف سول ملازمتوں ہی کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے اس لیے کہ فوجی اعلیٰ عہدوں پر ہندوستانیوں کا کہیں گذر ہی نہیں تھا۔ اسی سلسلے میں تعمیری کاموں میں سے کاونسل ایکٹ ۱۸۶۱ء تعلیم کی تدریجی ترقی اور لوکل سلف گورنمنٹ کے اداروں کا ذکر بھی ضروری ہے۔ غیر سرکاری نامزد شدہ ممبران کاونسلوں کے زیادہ تر ایسے ہی تھے جیسے کہ بعد کے نامزد ممبران ہمارے تجربہ میں آئے ہیں۔ کانگریس کے ایک مقرر نے اس زمانے کی کاونسلوں کو دکھاوے کی گڑھیا یا دھوکے کی ٹٹی کے نام سے یاد کیا ہے اور ان کے نامزد ممبران کو شاندار قیدیوں کا لقب دیا ہے۔

ایک مزے کی بات قابل ذکر ہے۔ وہی نامزد ممبر جنھوں نے لارڈ لٹن کے زمانے میں ورنا کلر پریس ایکٹ کی تائید میں ووٹ دیے تھے یہ بات کس قدر مضحکہ خیز ہے کہ انھیں نے لارڈ رپن کے زمانے میں اس کے خلاف ووٹ دیے۔ اُن کے زمرۂ انتخابات گورنمنٹ ہاؤس تھے اور وہ اپنے حقوق تک

ادا کرنے میں پکے تھے مگر ساتھ ہی ساتھ اس بات کا بھی لحاظ رکھنا چاہیے کہ ان میں سے وشوا ناتھ نرائن منڈلک ایسے لوگ بھی ہوئے ہیں اور کچھ دنوں بعد جب الکشن کا شائبہ نظر آنے لگا تو نامزد ممبروں میں دادا بھائی نوروجی - راناڈے - تلنگ - طیب جی - مہتا - ایسے اشخاص صوبۂ بمبئی میں کرسٹوداس پال راجہ پیارے موہن مکرجی ایسے بنگال میں - سر یس سبرا منیم ایر صوبۂ مدراس میں اور پنڈت اجودھیا ناتھ ایسے محب وطن ممالک مغربی وشمالی (صوبہ متحدہ) میں نظر آتے ہیں - جب آزاد تجارت کی آڑ میں لنکا شائر مال پر درآمدی ٹیکس معاف کر دیا گیا تھا تو انھیں ممبروں میں سے ایک مسٹر منڈلک بھی تھے - انھوں نے اس کی مخالفت کی مگر جب مخالفت کارگر نہ ہوئی تو دوسرے دن وہ کاؤنسل میں گھر کے کتے ہوئے سوت کے کپڑے یعنی کھدر پہن کر آئے اور یہ بتایا کہ اس سے وہ سیاسی احتجاج کرنا چاہتے ہیں - مسٹر منڈلک نہایت صاف گو شخص تھے ان کو لبو شبو نہ آتی تھی - جو کچھ وہ کرنا چاہتے کر ڈالتے اور اس کے ساتھ ساتھ اس کے کرنے کی وجہ بھی ظاہر کر دیتے ان کی شہرت بحیثیت مقنن بہت زیادہ تھی اور وہ اپنی آزاد رائے وخود مختارانہ طبیعت کے لیے بھی بہت مشہور تھے - میرا مقصد اس کے کہنے سے یہ ہرگز نہیں ہے کہ میں نامزدگیوں کا مؤید ہوں - نامزد لوگوں میں ایسی مثالیں شاذ ونادر ملتی ہیں - میں انتخاب کے طریقے کو باوجودیکہ اکثر الکشن میں غیر مستحق نااہل وناکارہ کامیاب ہوجاتے ہیں خراب نہیں تصور کرتا ہوں - یوں دیکھتے ہوئے رائے عامہ کو منظم کرنے کے لیے ہمارے تین صوبوں میں کام شروع ہو گیا تھا مگر خاصکر یہ کام بنگال وبمبئی میں ہوتا رہا - ہمارے قائد اعظم دادا بھائی نوروجی تھے اور ان کے فیضان ہدایت کے تحت میں مہادیو گوبند راناڈے - فیروز شاہ مروان جی مہتا نے کام کیے اس فیض سے

جنھوں نے اثر لیا ان میں سے بدرالدین طیب جی - ڈبلو - سی برجی - من موہن گھوش اور آر - سی دت ہیں - بنگال میں اس زمانے کی سیاسی زندگی میں مسٹر کرسٹو داس پال کی نہایت زبردست ہستی تھی - آپ پترکا کے اڈیٹر تھے اور آپ کی تحریر کا بہت اثر پڑتا تھا - صوبجاتی انجمنوں نے قائم ہو کر اتحاد و یکجہتی کی بنیادیں مضبوط کرنا شروع کر دی تھیں اور اس کے بعد آنے والے دور کے لیے جس میں کہ کانگریس کی بنیاد پڑی ایک مستقل و مضبوط راستہ بنا رکھا تھا -



فصل دوم

۱۸۸۵ء تا ۱۹۰۵ء

کانگریس کے ابتدائی ۲۰ برس

ایک مستقل قومی انجمن کے قیام کا خیال چند سربرآوردہ اشخاص کے دلوں میں پہلے آ چکا تھا جس نے ایک عملی جامہ ۱۸۸۵ء میں پہنا - اس انجمن کا نام انڈین نیشنل کانگریس تجویز ہوا اور پونا اس کے لیے چُنا گیا مگر اس سال پونا میں ہیضہ کا بہت زور تھا اس لیے بمبئی میں گوکل داس تیج پال ہائی اسکول کے ہال میں پہلے پہل ۲۸ دسمبر ۱۸۸۵ء کو اجلاس منعقد ہوا جس میں چند چیدہ اشخاص بحیثیت ڈیلیگیٹ کے شریک ہوئے - اس اجلاس کے صدر مسٹر ڈبلو - سی بنرجی تھے اور جن لوگوں نے اس میں شرکت کی ان میں سے دادا بھائی نوروجی - فیروز شاہ مہتا - کاشی ناتھ ترمبک تلنگ - جھاویری لال وجانک - ڈنشا ایڈل جی واچا - آر - ایم سیانی - گوپال گنیش اگرکار اور نرائن گنیش چندر ورکر بمبئی کے - سریس سبرا مینا ایر - دیوان بہادر راگوناتھ راؤ - پی - انند چارلو - جی - سبرامینا ایر - پی - رنگیا نیڈو - اور ویرا راگھواچاریار مدراس کے - بابو نریندر ناتھ سین کلکتہ کے شریک ہوئے -

ایک ۲۲ برس کا نوجوان جس نے لکھنؤ سے بمبئی کی مسافت طے کی جس کی اس وقت کوئی شہرت نہ تھی بابو گنگا پرشاد ورما تھے جو اس کے بعد ۲۸ برس زندہ رہ کر مادر وطن کانگریس کے انتہائی ولدادہ اور نہایت مخلص کارکن ثابت ہوئے۔ چونکہ اس وقت میں اندھرا یونیورسٹی کی بحث میں لکچر دے رہا ہوں اور میرے سامعین بھی اندھرا کے رہنے والے ہیں اس لیے میں ان اندھرا کے باشندوں کو جو پہلی کانگریس میں شریک ہوئے بتاؤں گا۔ اہل اندھرا میں سے مسٹر ریس۔ پی نرسمبھالو نیڈو کوئمبٹور کے رائے بہادر اب سبھاپتی مدھولیار بلاری کے دیوان بہادر پی کیسو پلے گوٹی کے اور راؤ صاحب سب کا راجو ونکاٹا سا بھینڈو بنٹا لو گار و سلیم (جن کا نام مسٹر بدرالدین طیب جی نے ظاہر نہیں کیا) شریک تھے۔ کانگریس کے قائم کرنیوالوں میں سے اس وقت صرف سر ڈنشا واچا زندہ ہیں اور باوجود ۹۲ برس کے تندرست و خوش ہیں (ڈنشا واچا کا اب انتقال ہوگیا)۔ جس شخص نے کہ کانگریس قائم کرنے میں بہت زیادہ نمایاں حصہ لیا اور جو ۶ برس تک اُس کا روح رواں تھا وہ۔ اے۔ ہیوم کی ہستی ہے انھیں کانگریس کے باپ کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ آپ اس کے جنرل سکریٹری ہوئے اور آپ نے اپنے خرچ سے ہندوستان کے گوشہ گوشہ کا سفر کیا اور کانگریس کے مقاصد کی پوری نشر و اشاعت کی۔ آپ کی ذات میں قدرت نے مسحور کر دینے کی عجیب خاصیت ودیعت کی تھی اگر کوئی نہایت مجہول ہستی و کاہل شخص بھی آپ سے ملتا تو وہ آپ سے ملنے کے بعد نہایت کارکن و بے چین دل و دماغ والا آدمی بن جاتا۔ یہ بات بھی اس مقام پر قابل ذکر ہے کہ حکام کو پوری اجازت کانگریس کی شرکت کے لیے اُس وقت حاصل تھی یہاں تک کہ پہلی کانگریس کی قرار دادیں سب الفنسٹن کالج کے پرنسپل مسٹر ورڈس ورتھ کے بنگلے پر ایک مخصوص جلسہ میں مرتب ہوئیں اور جس میں

حکام کے زمرہ میں سر ولیم وڈربرن، مسٹر راناڈے اور رائے بہادر لالہ بیجناتھ آگرہ کے بھی شریک تھے۔ مسٹر راناڈے تو کانگریس کے بھرے جلسے میں بھی شریک ہوئے تھے اور بحث ومباحثہ میں بھی آپ نے کافی حصہ لیا تھا۔ تمثیلاً یہ بھی عرض کروں گا کہ مسٹر راناڈے نے نامزد ممبر ہونے کے باوجود بمبئی کاونسل میں ایسی تجاویز پیش کیں جیسی کوئی منتخب شدہ ممبر پیش کر سکتا ہے۔ اسی طرح بنگال میں سر ہنری کاٹن اور مسٹر آر۔ سی دت نے ایک بار منتخب شدہ ممبروں کی تائید میں گورنمنٹ کے خلاف ووٹ دیے۔ سر ہنری کاٹن گورنمنٹ کے چیف سکرٹیری تھے۔ ع

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا

البتہ ۱۸۹۰ء میں کچھ بدمزگی پیدا ہوگئی تھی۔

کانگریس اور حکام

جب کلکتہ میں کانگریس منعقد ہونے والی تھی تو اس سال وائسرائے کے آدمیوں اور اسٹاف کے ممبروں کے نام عام دعوت نامے شرکت کے لیے بھیجے گئے جس پر یہ جواب آیا کہ حکام سیاسی انجمنوں میں شرکت کرنے سے معذور ہیں۔ اس غلط فہمی کا فوراً ازالہ ہوگیا پھر کوئی دقت باقی نہیں رہی۔ جب ۱۸۸۷ء میں کانگریس مدراس میں ہوئی تو خود گورنر لارڈ کونیمرا نے استقبالیہ کمیٹی کی اپنے گھر سے سامان فراہم کرکے امداد کی مگر ۱۸۸۸ء میں جب کانگریس الہ آباد میں ہوئی تو سر آکلینڈ کالون نے یہ ارادہ کرلیا کہ کانگریس منعقد ہی نہ ہو اور طرح طرح کی دقتیں استقبالیہ کمیٹی کے راستہ میں حائل کیں۔ بڑی دقتوں سے جلسہ کے لیے جگہ ملی۔ اسسال کی کانگریس ونیز ۱۸۹۲ء کی کانگریس لوتھر کاسل کے میدان میں منعقد ہوئی۔ اس لوتھر کاسل کو مہاراجہ صاحب دربھنگہ نے جو کانگریس کے ایک سرگرم ہمدرد تھے خرید لیا تھا۔ اُس وقت سے اب یہ مقام دربھنگہ کاسل کے نام سے مشہور ہے۔ جب ۱۸۹۱ء میں

ناگپور میں کانگریس ہونے والی تھی تو مسٹر آر۔ پی (پھر سر و بعدہٗ لارڈ) میکڈانل نے عام طور پر یہ ظاہر کر دیا کہ جو چاہے اس میں شریک ہو اور جو نہ چاہے نہ شریک ہو گورنمنٹ کو کوئی اعتراض نہیں ہے۔ ۱۸۹۹ء کی لکھنؤ والی کانگریس کے راستہ میں وہاں کے ضرورت سے زیادہ جوشیلے ڈپٹی کمشنر نے رکاوٹیں پیدا کیں مگر لفٹنٹ گورنر سر انٹنی میکڈانل نے سہولتیں پیدا کر دیں اور ڈپٹی کمشنر کا حکم مسترد کر دیا۔ مدراس میں جب ۱۹۱۴ء میں کانگریس ہونے والی تھی اُس وقت وہاں کے گورنر لارڈ پنٹلینڈ (Lord Pentland) نے خود اس کے اجلاس میں شرکت کی اور دو برس بعد جب ۱۹۱۶ء میں کانگریس کا اجلاس لکھنؤ میں ہوا تو سر جیمس مسٹن (اب لارڈ) جو اس وقت لفٹنٹ گورنر تھے وہ اس سے بھی آگے بڑھے اور خود اس میں تقریر کی مگر ۱۸۸۸ء کے واقعات خاص طور پر یاد رکھنے کے قابل ہیں لارڈ ڈفرن نے کانگریس کے اہم و سرگرم کارکنوں پر اپنا انتہائی غصہ اور اپنے دل کی پوری بھڑاس سنٹ اینڈ روز ڈنر میں نکالی۔ میں اپنے ان نوجوانوں سے استدعا کروں گا جنھیں ہندی سیاسیات کے مطالعہ کا ذوق ہے کہ وہ ان تمام واقعات و مباحث کا جو سر آکلینڈ کالون و لارڈ ڈفرن (حکام) و مسٹر ہوم مسٹر مارٹن و مسٹر نبلنگ (غیر سرکاری) اشخاص کے درمیان رونما ہوئے خاص طور پر پڑھیں۔

پہلی کانگریس

پہلی کانگریس میں چند ایسے مباحث پیش ہوئے جو اب تک تازہ و دلچسپ معاملات سمجھے جاتے ہیں۔ پہلی تجویز جو ہندی حکمرانی کے بارہ میں شاہی کمیشن مقرر کیے جانے کے لیے تھی مسٹر جی سبرامینا ایر جنھوں نے ہندو کے ذریعہ مدراس میں سیاسی زندگی کی ترغیب دی ہے پیش کی تھی۔ اسی کانگریس میں مجلس قانون ساز کی وضاحت اور ساتھ ہی ساتھ انڈین سول سروس کے امتحان کے لیے قرار دادیں پاس کیں۔ اسی اجلاس میں سر فیروز شاہ مہتا

نے برھما کو ہندوستان کے ساتھ شامل کرنے کے لیے مخالفت کی اور یہ بتایا کہ اگر بفرض محال برھما شامل ہو تو ایسی صورت میں برطانوی تاج کی نوآبادی قرار دیا جائے اور ہندوستان کے بجٹ کا اس سے کوئی تعلق نہ رکھا جاوے۔ مقام غور ہے کہ جب ہندوستان کے بجٹ کا بہت کافی روپیہ تینوں برھما کی جنگوں پر دگورنمنٹ پر صرف ہو چکا تو اسے علیحدہ کردیا جارہا ہے۔ طرفہ تماشا تو یہ ہے کہ جو لوگ وہاں آباد ہو چکے ہیں ان کے ساتھ مساوی عدل و انصاف کا نہ کوئی خیال ہے اور نہ ان کے مالی نقصانات کا کوئی لحاظ رکھا جارہا ہے۔ نفس معاملہ یہ ہے کہ جس وقت سر ہارکورٹ بٹلر برھما کے لفٹنٹ گورنر تھے اسی زمانے میں گورنمنٹ ہند نے ایسے قوانین و قواعد کے مرتب کرنے کا ارادہ ظاہر کردیا جس سے ہندوستانیوں کی برھما میں وہی حیثیت ہوجاوے جو کینیا میں حاصل ہے۔

کانگریس کا دوسرا اجلاس

دوسرے سال جب کانگریس کلکتہ میں ہوئی تو اس کے لیے مندوبین (delegates) کا انتخاب عام جلسوں و عام انجمنوں سے ہوا جن کی تعداد ۴۳۶ تھی پہلی کانگریس میں مندوبین کی تعداد صرف ۷۰ تھی۔ دو دن تک اس کا اجلاس برٹش انڈین ایسوسی ایشن کے ہال میں ہوا مگر جگہ کی قلت کی وجہ سے ٹاؤن ہال میں دو دن اجلاس منعقد ہوا۔ امسال کانگریس کو جو مقتدر ہستیاں ملیں ان میں راجہ راجندر لال متر استقبالیہ کمیٹی کے صدر جو سر راما کرشن بھنڈارکر کی طرح ہندوستان کے سب سے بڑے مستشرق تھے خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ سرندرناتھ بنرجی و پنڈت مدن موہن مالوی بھی اسی سال شریک ہوئے۔

تیسری کانگریس

ہر سال کانگریس زور پکڑتی گئی اور جو کانگریس ۱۸۸۷ء میں مدراس میں ہوئی اس کے پہلے معروف و مشہور

مسلمان صدر مسٹر (بعدہ جسٹس) بدرالدین طیب جی ہوئے اور اس کی استقبالیہ کمیٹی کے صدر ہندوستان کے سب سے بڑے مدبر راجہ سرٹی مادھوراؤ تھے جنھوں نے کانگریس کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے -

"برطانوی نظم ونسق کی مضبوط ترین کامیابی اور برطانوی قوم کا عظمت بخش تاج"۔ مندوبین کی تعداد، ۶۰ پہونچی تھی - اس سال کے نئے قابل قدر شرکا میں گذشتہ سالوں کے شرکا کے علاوہ ونیز سرٹی مادھوراؤ ومسٹر بدرالدین طیب جی کے مسٹر آر ڈلی نارٹن - پنڈت بشن نرائن در - سر شنکارن نیر - مسٹر جان اڈم - مسٹر سالم راما سوامی مڈیسرا اور اس شہر کے مسٹر (بعدہ سر) بی - این شرما تھے - مقامی دلچسپی کے لیے یہاں یہ بھی کہوں گا کہ ان معزز لوگوں کی فہرست میں جنھوں نے کانگریس کو چندے دیے اور جو وزیٹر کی طرح شریک اجلاس ہوئے مہا راجہ سرانند گجاپتی راج وجیانگر کے تھے جو انسان کے روپ میں صبرو استقلال کے دیوتا تھے اور سخاوت کی تصویر مجسم تھے اور دلفریب شہزادہ کے لقب سے مشہور تھے - بہتوں کو آج یہ بات نہ معلوم ہوگی کہ اس سخی وخیر وخیرات کرنیوالے شخص کے سرندرناتھ بنرجی (بنگال کے) اور مسٹر جی - سبرا مینا ایر (مدراس) کے درمیان نہایت زبردست رشتہ اخوت ورفاقت قائم تھا اور انڈین ایسوسی ایشن کا دفتر آپ ہی کے جذبہ سخاوت کا ایک ادنیٰ نمونہ تھا - میں نے ۱۸۸۶ء کے ان نامور اشخاص کا ذکر کرتے ہوئے جو کانگریس کو ملے تھے مسٹر آر ڈلی نارٹن کا ذکر کیا ہے - اگر میں اس مقام پر شروع کی کانگریس میں جو متعدد معرکۃ الآرا تقریریں دی ہیں اس کا ذکر کروں تو میرے لکچر بہت طویل ہوجاویں گے اس لیے جہاں تک ممکن ہے میں اس سے گریز کروں گا - تاہم مسٹر نارٹن کی پہلی معرکۃ الآرا اسپیچ سے ایک ٹکڑا میں یہاں پیش کرتا ہوں جو کیفیت زمانہ کے مطابق ہے اس لیے کہ

آج کل بغاوت کے الزام میں ماخوذ کیا جانا، آئے دن کا دھندھا ہے اور ہم سب اس سے خوب واقف ہو چکے ہیں۔ کسی انگریز نے مسٹر نارٹن کو نقاب پوش (چھپے ہوئے) باغی کانگریس کے شریک ہونے پر کہا تھا۔ مسٹر نارٹن لاپرواہ شخص نہ تھے اور آپ نے اُس کا جواب یوں دیا ہے جو عرصہ تک یاد کیا جاوے گا۔

"حضرات۔ اگر تمام برائیوں کے خلاف بغاوت کرنا اگر اس پر اصرار کرنا کہ ملک کے باشندوں کو وہاں کے انتظام و انصرام میں مناسب حصہ ملے اگر طبقہ وارانہ نظام کے خلاف جد و جہد کرنا، اگر ظلم و تعدی کی مخالفت کرنا اگر سزا سے پہلے صفائی پیروی و روبکاری کے لیے ضد کرنا اگر شخصی ارادے کو قائم و برقرار رکھنے کے لیے کوشاں ہونا اور حقوق بین الافراد کے لیے سعی کرنا اصلاحات عامہ کے لیے جد و جہد کرنا بغاوت ہے تو میں نہایت مسرور ہوں کہ مجھے باغی کہا جاوے اور میری مسرت دونی۔ تگنی ہو جاتی ہے اس کی کوئی حد و نہایت نہیں رہتی جب میں آج کے دن اپنے چاروں طرف ایسے ہی لوگ ایسے ہی مقتدر باغی اپنے گرد و پیش پاتا ہوں جس میں میرا بھی شمار ہے۔"

چوتھی کانگریس

ہر سال کانگریس زور پکڑتی گئی ۱۸۸۸ء میں گذشتہ دونوں سالوں سے کہیں زیادہ اس کی مخالفت ہوئی، سر آک لینڈ کالون اور سر سید احمد خاں نے مل کر اس کی مخالفت شروع کی آخر الذکر نے اپنے برادران ایمانی کو اس کی سخت مخالفت پر آمادہ کیا اور اینگلو مسلم ڈفنس ایسوسی ایشن قائم کی۔ اس مخالفت کا اثر بالکل الٹا ہوا چنانچہ اگلی بار کا اجلاس گذشتہ جلسوں سے کہیں زیادہ کامیاب ہوا۔ شیر ممالک متحدہ پنڈت اجودھیا ناتھ استقبالیہ کمیٹی کے سرپرست تھے۔ اور آپ نے اپنی شعلہ آمیز تقریروں کے ذریعے سے لوگوں کو کانگریس کی شرکت پر آمادہ کیا۔ آپ کانگریس کو کسی قیمت پر بند کرنے کو تیار نہ تھے

اور اگر ضرورت ہوتی تو اس کے کل مصارف برداشت کرنے کو بھی تیار تھے۔ اس کے تین برس بعد آپ کی وفات صرف ۵۱ برس کی عمر میں ہوئی یہ اہم سانحہ قومی بدبختی سے ہمیشہ تعبیر کیا جائے گا۔ اس سال مندوبین کی تعداد ۱۲۲۸ تھی تقریباً تمام سربرآوردہ اشخاص اس اجلاس میں موجود تھے اور حصہ لیا۔ اس سال کے اجلاس کی رپورٹ سیاسی تعلیم کے مطالعہ کے لیے ضروری ہے اور اس سال کی صدارت پہلی مرتبہ ایک انگریز مسٹر جارج یول George Yule نے جو کلکتہ کے ایک سربرآوردہ تاجر تھے کی۔ آپ کا خطبۂ صدارت نہایت گراں قدر ہے جس کا مطالعہ اس زمانہ میں بھی مفید ہے۔ آپ نے یہ بتایا کہ کانگریس کی ایسی سب تحریکوں کو مختلف نشیب و فراز درپیش ہوئے ہیں" پہلا زمانہ وہ ہے جس میں مذاق اڑایا جاتا ہے اس کے بعد جب تحریک زور پکڑتی ہے تو گالیوں کی بوچھار شروع ہوتی ہے۔ اس کے بعد مقاصد کے متعلق غلط فہمیاں شروع ہوتی ہیں اور کچھ رعایت بھی کی جاتی ہے پھر پند و نصائح کا زمانہ آتا ہے جس میں کہا جاتا ہے کہ دیکھو اندھیر میں ہاتھ نہ ڈالو آخر میں مقاصد کی ایک مہتم بالشان وقعت کی جاتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس پر تعجب کا اظہار بھی ہوتا ہے یہ مختلف زمانے گھٹتے بڑھتے بھی رہتے ہیں مگر پہلے اور آخری دور میں بیّن فرق رہتا ہے"۔

پانچویں کانگریس

اس کانگریس میں شرکار کی تعداد پہلے سے بہت زیادہ تھی۔ یہ اجلاس بمبئی میں بصدارت سر ولیم وڈر برن منعقد ہوا جس میں (Charles Bradlaw) چارلس بریڈلا بھی شریک ہوئے۔ عجب اتفاق دیکھیے کہ جب کانگریس ۱۸۸۹ء میں ہوئی تو مندوبین کی تعداد بھی اس سال ۱۸۸۹ تھی۔ اسی سال مسٹر گوکھلے پہلی مرتبہ کانگریس میں شریک ہوئے اور آپ کی پہلی تقریر اس نوعیت و حیثیت کی تھی جس پر لوگوں نے

پیشین گوئی کی کہ یہ آیندہ کانگریس کے صدر ہوں گے۔ آپ کی کامیابی بالکل بیساختہ اور فوری تھی جس کا تقابل مسٹر اسکوتھ کی اس تقریر سے بخوبی کیا جا سکتا ہے جو انھوں نے پہلی بار دارالعوام میں کی تھی جس پر سیاسی پیشینگویوں نے یہ پیشینگوئی کی تھی کہ اسکوتھ آیندہ وزیراعظم ہوں گے۔ اجلاس کے اختتام پر ملک کے مختلف حصوں کی جانب سے مسٹر بریڈلا کی خدمت میں سپاسنامہ پیش کیا گیا جس کے جواب میں آپ نے اپنی یادگار زمانہ تقریر میں یہ الفاظ فرمائے تھے۔

"میں عوام کے علاوہ کس کے لیے کام کروں۔ میں عام طبقہ میں پیدا ہوا ہوں اور عام طبقہ کا مجھ پر اعتماد ہے میں اسی عام طبقہ کی خدمت کرتے ہوئے مروں گا۔ میں جغرافیادی حدود و قومی قیود سے بالکل آزاد و مستثنیٰ ہوں"۔

بعد کے اجلاس اس زمانے میں سب سے زیادہ ضروری تجویز مجلس قانون ساز کے بڑھانے اور اس میں اختلافات کے متعلق پیش ہوتی رہی اور انڈین کاونسل ایکٹ ۱۸۹۲ء کے پاس ہونے کے بعد جس تجویز نے یہ جگہ اختیار کی وہ آئی۔ سی۔ ایس امتحان کو ہندوستان و انگلستان دونوں ملکوں میں ساتھ ساتھ ہونے کی تجویز تھی۔ ۱۸۹۳ء میں مسٹر ہربرٹ پال نے دارالعوام میں اس کے بارے میں ایک تجویز پاس کرائی مگر انگلستان و ہندوستان کی گورنمنٹ نے مل کر دہ کیا جس سے وہ تجویز صرف ایک کاغذی تجویز ہو کر رہ گئی۔ ۱۸۹۳ء میں کانگریس لاہور میں ہوئی جس کے صدر مسٹر دادا بھائی نوروجی دوسری بار منتخب ہوئے یہ یادگار اجلاس تھا اس لیے کہ مسٹر دادا بھائی اس سے ایک سال قبل دارالعوام کے رکن منتخب ہو چکے تھے۔ آپ پہلے ہندوستانی ہیں جنھیں ممبر پارلیمنٹ ہونے کا فخر حاصل ہے۔ اور یہ عزت ۳ برس بعد ایک دوسرے پارسی سر منچر جی بھونگری کو حاصل ہوئی جو ہندی قومی تحریکوں سے الگ تھلگ رہے اس کے بعد ایک

اور پارسی کو یہ شرف حاصل ہوا یعنی مسٹر سکلتوالا کو۔ ان تینوں اشخاص کو چھوڑ کر کوئی اور ہندوستانی دارالعوام کا ممبر منتخب نہیں ہوا حالانکہ متعدد اشخاص اس کے لیے کھڑے ہوئے۔ خود مسٹر ڈبلو۔ سی۔ بنرجی نے متعدد بار قسمت آزمائی فرمائی۔ ہاؤس آف لارڈ کے ممبر لارڈ سنہا ضرور ہوئے اور آپ پہلے ہندوستانی تھے جو اس ہاؤس کے ممبر ہوئے۔ دادا بھائی نوروجی کا اس دن سے جس دن سے کہ وہ بمبئی میں اترے اور جب تک کہ وہ پھر انگلستان کے لیے روانہ نہ ہولیے ہر ہر مقام پر اور ہر ریلوے اسٹیشنوں پر جہاں ان کی گاڑی ٹھہری ایسا شاندار اور عدیم المثال خیر مقدم کیا گیا کہ جس کے مقابلہ میں وہی استقبال ہو سکتا ہے جو ان کو ۱۳ برس بعد دیا گیا جب وہ دوسری مرتبہ کانگریس کی صدارت کے لیے آئے اس استقبال کے بارے میں سُرندرناتھ بنرجی کے الفاظ یہ ہیں "شاہزادے اور بادشاہ رشک کریں مگر دل پر قابو کہاں نصیب ہے"۔ ۱۹۰۵ء تک کانگریس نہایت اطمینان و میل جول سے کام کرتی رہی۔ شاید ہی کوئی ایسا اہم پبلک معاملہ رہا ہو جس کی جانب توجہ نہ کی گئی ہو اور جس کے متعلق تجاویز نہ لائی گئی ہوں جس سے عمائدین کانگریس کی سیاسی فراست کا پتہ چلتا ہے۔

انڈین کاونسل ایکٹ ۱۸۹۲ء

۱۸۶۱ء کے ایکٹ کے ٹھیک ۱۳ برس بعد اور اس احتجاج کی وجہ سے جو کانگریس نے مسلسل چھ برس تک جاری رکھا اور انگلستان دو وفد روانہ کئے کاونسل ایکٹ ۱۸۹۲ء پاس ہوا اس نے جو حقوق دیے وہ آج نہایت حقیر معلوم ہوتے ہیں مگر زمانہ اور حالات کا لحاظ کر کے اگر دیکھا جائے تو جو کچھ ملا تھا وہ بہت کچھ تھا۔ اس ایکٹ کے رو سے ممبروں کی تعداد بڑھ گئی اور یونیورسٹیوں اور تجاروں کی انجمنوں کو چند ممبروں کی نامزدگی کا اختیار مل گیا مگر صحیح معنوں میں انتخاب کے

اصول کی ابتدا نہیں ہوئی - سوالات دریافت کرنے کی اجازت ملی مگر معاونی سوالات پیش کرنے کا حق نہیں ملا - کاونسل کو بجٹ پر بحث کرنے کا اختیار دیا گیا مگر کسی مد میں تنسیخ یا ترمیم کی تجویز پیش نہیں کی جا سکتی تھی - تجاویز پیش کرنے کا بھی حق ممبروں کو نہیں دیا گیا تھا - اس ایکٹ کے تحت میں جو قواعد وضوابط مرتب ہوئے وہ بہت زیادہ نامناسب تھے جس کی وجہ سے احتجاج ومخالفت کا بازار گرم ہو گیا - جب مسودہ پارلیمنٹ کے سامنے پیش تھا تو وزیر اعظم اور مخالف پارٹی کے لیڈر لارڈ سیلسبری (Salisbury) اور گلیڈ سٹون نے یہ چاہا کہ ہندوستان کے باشندوں کو ان کے حقیقی بہی خواہ اور کام کرنے والے نمایندے ایکٹ کی تحت میں ملیں - برخلاف اس کے جو قواعد بنائے گئے وہ اس کے بالکل منافی تھے - باوجود ان قیود کے جو ممبروں پر عاید کیے گئے تھے تقریباً سب نے کارآمد کام کیے اور چند نے اپنی انتہائی قابلیت کا ثبوت دیا - ان میں سے سر فیروز شاہ مہتا اور مسٹر گوکھلے نے اپنی پارلیامنٹری معلومات وقابلیت کے جھنڈے گاڑ دیے - اسی زمرے میں جن لوگوں نے نمایاں خدمات انجام دیں سر سُرندر ناتھ بنرجی (جن کی کلکتہ میونسپل بل کی خدمات کبھی بھلائی نہیں جا سکتیں) اور انند موہن بوس بنگال میں - مسٹر سی وجار گھوچاریا اور مسٹر این سبراؤ پنٹلو مدراس میں سر چمن لال سیتل واد اور سر گوکل داس پاریک بمبئی میں - پنڈت مدن موہن مالویہ ممالک متحدہ میں ہیں - اگرچہ ان لوگوں کی ان تھک محنتیں ہمیشہ بار آور نہیں ہوئیں تو اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہیے کہ ان حضرات کے کام معمولی تھے - یہ ضرور ہے کہ بیشتر انھیں ناکامیاں ہوئیں پھر بھی اگر ان لوگوں نے ناقابلیت دکھائی ہوتی یا غیر ذمہ داری ظاہر کی ہوتی یا رعایا کی بھلائی کے لیے نہ کوشاں رہے ہوتے تو مارلے منٹو (Morley-Minto) کونسلوں کا کہیں وجود ہی نہیں ہوا ہوتا - بقول

کانگریس کے بابائے اعظم کے سچے قومی کارکنوں کو یہ سمجھ رکھنا چاہیے کہ بے لوثی اور ایمانداری سے کام کرنے میں آخر میں کامیابی ضرور ہے ۔

لارڈ لینسڈاون

اس کے بعد تو ہندوستان میں جو وائسرائے آئے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا وہ ہندوستانیوں کے خلاف کمربستہ ہو کر آرہے ہیں اور انھیں اہل ملک کے جذبات و احساسات کا کوئی خیال ہی نہیں ہے ۔ لارڈ ڈفرن کے بعد لارڈ لینسڈاون وائسرائے ہوئے اور انھوں نے تو وہ کیا جسے ۲۶ رجون ۱۸۹۳ء کا جرم کہا جاتا ہے ۔ یعنی مجلس قانون ساز کی ایک نشست میں جب سب کے سب منتخب شدہ ہندی ممبر غیر حاضر تھے ایک تجویز فوراً پاس کرا دی جس کی رو سے ہندوستان کی ٹکسالوں میں چاندی کا سکہ ڈھلنا بند ہوگیا ۔ یہ ہمارے Currency Exchange. کی ابتدا تھی جس کا انسداد ۲۴ برس کے بعد آج بھی نہیں ہو سکا بلکہ خیال تو یہ ہے کہ آیندہ نظام میں یہ غلطیاں برقرار رہیں اس لیے کہ نام نہاد ذمہ دار گورنمنٹ کو اس نظام میں اختیار ہی حاصل نہیں ہے تاوقتیکہ گورنر جنرل وزیر ہند کی پہلے سے منظوری نہ حاصل کرے جس کا حاصل ہونا کوئی آسان بات نہیں ہے ۔

ایکس چینج کمپیسیشن الاونس

اسی دن انگریزوں کے لیے وہ مشہور ایکس چینج کمپیسیشن الاونس بھی پاس ہوا جس پر جس قدر اعتراض کیا جاوے بالکل بجا ہے ۔ اس کے علاوہ اور بھی دوسرے الاونس ان افسروں کے لیے مقرر کیے گئے جس کو سر عبدالرحیم نے ایک ایک کرکے اپنی اقلیت کی رپورٹ متعلقہ اسلنگٹن کمیشن برائے آئی سی ایس ۱۹۱۵ء میں گن دیا ہے اور جس میں لی Lee کمیشن ۱۹۲۳ء نے باوجود ان بڑی بڑی تنخواہوں کے جس کے برداشت کی طاقت اس غریب ملک کو نہیں ہے

مزید اضافے کر دیے ہیں۔ چنانچہ ۱۸۹۴ء کی کانگریس میں لالہ مرلی دھر نے جو ایک پنجابی محب وطن تھے تقریر کرتے ہوئے یوں کہا ہے۔

"اونٹ کا سوئی کے ناکے میں سے نکلنا بہ نسبت ایک مالدار آدمی کے بہشت میں داخل ہونے کے زیادہ آسان ہے۔ اگر انجیل مقدس کے ان الفاظ کے لفظی مفہوم لیے جاویں اور ایک آسمانی کتاب کے الفاظ کی وجہ سے بالکل صحیح مان لیے جاویں تو بیشک یہ بھی صحیح ہے کہ ہندوستان سب ملکوں سے زیادہ خوشحال ہے اور یہاں کے باشندے سب سے زیادہ مالدار ہیں۔ ہم لوگوں کو انگلینڈ کے ان مالدار لوگوں پر افسوس ہے جنھوں نے بڑی بڑی دولتیں جمع کر رکھی ہیں........ ہمیں خدا کا شکرا دا کرنا چاہیے کہ اس نے ہمیں یہ مرتبہ عطا فرمایا ہے اور ہمارے لیے جنت کے دروازے کھول دیے گئے ہیں برخلاف اس کے وہ دروازے اہل یورپ کے لیے بند کر دیے گئے ہیں........ ہمیں حکام کا ممنون ہونا چاہیے کہ انھوں نے ایسے ایثار ہم لوگوں کے لیے کیے ہیں اور اپنے لیے ایکس چینج کمپیشن الاونس مقرر کیا ہے۔"

لارڈ الگن لارڈ لینسڈاون کے قائم مقام لارڈ الگن بہت ناکامیاب ثابت ہوئے۔ یہ ۱۸۹۶ء کے اس زمانے میں جب کہ قحط اس زور کا پڑا تھا کہ قحط کمیشن کے الفاظ میں انسان مثل مکھیوں کے قحط کی وجہ سے مر رہے تھے جبل پور گئے اور ممالک متوسط کے باشندوں کو جبل پور میں ان کی خوشحالی پر مبارکباد دی۔ ان کی گورنمنٹ نے ۱۸۹۵ء و ۱۸۹۶ء کی سرحدی مہموں کو اختیار کیا جن سے ملک کو ایک کثیر مالی نقصان ہوا اور ۱۸۹۶ء میں ان قوانین کو پاس کیا جس کے بارے میں ابھی بتایا جاوے گا اور یونائیٹڈ سروسز کلب شملہ میں اپنی تقریر میں یہ کہہ کر اپنی نیکنامی کا خاتمہ کر دیا "ہندوستان بزور شمشیر

فتح ہوا اور یہ بزور شمشیر مفتوح قائم رکھا جاوے گا۔

لارڈ الگن بعد میں جب سکریٹری نوآبادیات مقرر ہوئے تو انھوں نے ایسے احکامات جاری کیے جن کی وجہ سے ہمارے اہل وطن جو جنوبی افریقہ میں آباد ہیں کافی خسارہ اٹھاویں۔ لارڈ الگن دل کے اچھے اور ایماندار تھے مگر ان جگہوں کے لیے ناموزوں و نامناسب ضرور تھے۔ چنانچہ مسٹر انند چار بوسے جو ان کے ایک خاص دوست تھے لارڈ الگن نے خود اقبال کیا کہ ہندوستان کے بارے میں وہ بالکل کورے تھے اور اگر وہ اپنے مشیروں کی رائے پر نہ چلتے تو اور بیوقوف بنتے۔

۱۸۹۷ء

خزان ۱۸۹۷ء میں پہلے پہل طاعون کی بلا ہندوستان کے سر پر نازل ہوئی اور ساتھ ہی ساتھ قحط بھی پڑا۔ دوسرا سال تو ہندوستان کے لیے آلام و مصائب کا سال تھا جس میں قحط، طاعون، زلزلہ، جنگ و سختیاں سب کچھ ہوئیں اور بقول مسٹر راناڈے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کہ ساتوں بلیات کا یکبارگی ہندوستان پر حملہ تھا۔

طاعون کے انسداد کے لیے طریقے ضرور اختیار کیے گئے اور ان کے اختیار کرنے میں نیک نیتی ضرور شامل تھی مگر ایسے جبر و تشدد کے ساتھ اختیار کیے گئے جس سے مختلف مقامات پر نقض امن ہوکر رہا۔ اور پونا میں تو لوگوں میں ایسی بدگمانیاں پھیل گئیں کہ ملکہ معظمہ کی سالگرہ کے جشن کی رات کو وہ آئی۔سی۔ایس افسر مسٹر رنڈ جو ان احکام و طریقوں کا ذمہ دار تھا جب وہ گورنمنٹ ہاؤس سے واپس ہو رہا تھا قتل کر دیا گیا۔ اسی کے ساتھ ایک دوسرا افسر لفٹنٹ ایرسٹ بھی مار ڈالا گیا۔

اس خون ناحق اور حماقت نے گورنمنٹ کو انتہائی سختی پر مجبور کر دیا اور باقاعدہ سختی شروع کر دی گئی۔ گورنمنٹ کو یقین ہو گیا کہ کسی باضابطہ سازش

کی وجہ سے قتل ہوئے ہیں مگر اس کے برعکس مسٹر ڈبلو۔ ایچ کرو شنشن جج پونا نے جنھوں نے اس مقدمہ کی سماعت کی اور ملزمان (جبکار برادران) کو سزا دی اور جو بعد میں بمبئی ہائیکورٹ کے جج بھی ہوئے آپ نے جوری کے چارج میں اس بات کو ظاہر کردیا کہ انھوں نے سازش کی خاص طور پر چھان بین کی مگر شہادت سے اُنھیں کسی ایسی سازش کا پتہ نہیں چلا۔

سردار ناٹو (دونوں بھائی) کو بمبئی رگولیشن ۱۵ ۱۸۲۷ء کے تحت میں جلاوطن کیا گیا گو کہ یہ قانون اُس وقت کے لیے مرتب کیا گیا تھا جبکہ ہندوستان میں انگریزی عملداری غیر اطمینانی حالت میں تھی۔ علاوہ بریں مسٹر تلک اور چند دیگر سیاسی کارکنوں پر مقدمے چلائے گئے اور لمبی لمبی سزائیں دی گئیں تعزیرات ہند کے دفعہ ۱۲۴الف میں جو تنفر ''Disaffection'' کا لفظ واقع ہوا ہے اس کے مسٹر جسٹس (بعدہٗ سرآرتھر) اسٹریچی نے نئے معنی پہنائے اس سے مراد ''محبت کا فقدان ہے''۔ اسی صریحی غلط تاویل پر مسٹر تلک کو ۱۸ مہینے کی قید سخت جوریوں کی کثرت رائے سے تجویز ہوئی۔ اور صوبہ بمبئی میں پریس کمیٹیاں اخبارات کی جانچ پرتال وچھان بین کے لیے قائم کی گئیں۔

اس سال کے آخر میں وائسرائے کی مجلس قانون ساز میں ایسی بلیں لائی گئیں جن سے دفعہ ۱۲۴الف کو زیادہ اہم وسخت کرنا مراد تھا اور ایک نئی دفعہ ۱۵۳الف کا اضافہ بھی کیا گیا اسی زمانے سے دفعہ ۱۵۳ کو ۱۲۴الف کا ضمیمہ سمجھنا چاہیے جس کا مقصد دو فرقوں، قوموں کے درمیان فساد پھیلانے سے روکنا و سزا دینا اور ان لوگوں کو بھی مورد الزام قرار دینا ہے جو گورنمنٹ کے نزدیک اپنے الفاظ کی وجہ سے مورد الزام قرار دیے جا سکیں۔ اس کے علاوہ اُسی زمانے میں ضابطہ فوجداری کو ترمیم کرکے دفعہ ۱۰۸ کا اضافہ کرنا بھی متصور ہوا جس کے تحت میں ایسے ملزموں کو جن کے

اوپر دفعہ ۱۲۴ الف یا دفعہ ۱۵۳ الف عائد ہو انھیں بدمعاشوں کی طرح دفعہ ۱۰ اضابطہ فوجداری کے تحت میں مورد الزام بھی قرار دیا جا سکے۔ ایکٹ ڈاکخانہ جات کی ترمیم اس غرض سے بھی کی گئی تا کہ پوسٹ ماسٹر کو اختیار حاصل ہو جائے اگر کسی مراسلہ کو جس پر بغاوت کا شبہ ہو سکے جہاں چاہے روک لے۔

مہاراجہ سر لکھمیشور سنگھ بہادر والی دربھنگہ نے باوجودیکہ ان بلوں کی مجلس قانون ساز میں انتہائی مخالفت کی جس پر بھی یہ سب کے سب پاس ہو کر قانون بنا دیے گئے۔ تمام ملک میں صدائے احتجاج بلند ہوئی مگر کوئی سماعت نہ کی گئی۔ مجھے یہ تمام باتیں بخوبی یاد ہیں اور مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ لوگوں کا یہ خیال تھا کہ گورنمنٹ بمبئی بہت سراسیمہ تھی اور گورنمنٹ ہند نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اہل ملک کو ان کے تھوڑے بہت حقوق سے بھی محروم کر دیا۔

دکن کے چتپاون برہمن سیاسی مشتبہ خیال کیے جاتے تھے اس لیے کہ وہ شیواجی و پیشوا کے پرستاروں میں سے تھے۔ مسٹر تلک کا اُن کی شخصیت اور "کیسری" کی وجہ سے سخت مخالف شمار ہوتا۔ ان تمام واقعات کی خبروں کا ذریعہ گورنمنٹ کے نزدیک صرف پولیس تھی۔ لارڈ سنڈہرسٹ کی ناواقف اور ڈرپوک گورنمنٹ کو یہ یقین ہو چکا تھا کہ کوئی باقاعدہ منظم بغاوت پیش آنے والی ہے۔ صرف ہندوستانی مدبرین ہی کا یہ خیال نہیں تھا کہ گورنمنٹ بمبئی کا سر پھر گیا ہے اور وہ حماقتوں پر حماقتیں کر رہی ہے بلکہ سر اینٹی میکڈانل نے جو اس زمانے میں صوبہ متحدہ کے لفٹنٹ گورنر تھے پنڈت بشن نرائن در سے خود کہا۔ "یہ بغاوت بغاوت کا کیوں بیکار شور بپا ہے۔ ذرا مجھے تو بمبئی بھیجدیں میں پندرہ دن میں سب ٹھیک کیے دیتا ہوں"۔ یہ ضرور ہے کہ نظام سلطنت ایک بڑی حد تک بُرائیوں کی ذمہ دار ہو سکتی ہے مگر اس میں کوئی کلام نہیں کہ

حکمران کی شخصیت کا بہت بڑا اثر ہوتا ہے اور اگر اس کی مثال دیکھنی منظور ہو تو دُور نہ جائیے دس برس بعد کے واقعات یعنی سر مائیکل اوڈائر کے زمانے کے پنجاب کے اور بارہ برس بعد کے واقعات صوبہ متحدہ کے یعنی سر ہارکورٹ بٹلر کے زمانے کے حالات اس کی تصدیق کے لیے بہت کافی ہیں۔

لارڈ کرزن

اُدھر طاعون نہایت زور و شور سے ملک کے گوشے گوشے میں روز افزوں پھیل رہا تھا اور افسوسناک سیاسی مناقشات کا کسی حد تک باعث بنا ہوا تھا۔ اور اِدھر قحط ۱۸۹۶ء و ۱۸۹۷ء کے قحط سے بدرجہا زیادہ تباہ کن تمام ملک میں پھیل رہا تھا ۱۸۹۹ء کے آخر میں لارڈ کرزن ہندوستان کے وائسرائے ہو کر آئے اور سات برس تک متواتر بلاناغہ ایسے تباہ کن قوانین تجویز کیے جو ہندوستانیوں کے لیے کسی طرح قابل قبول نہیں ہوسکتے تھے۔ ہمیں یہ تسلیم ہے کہ انھوں نے چند بھلائیاں بھی کیں مگر مجموعی طور پر اس سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا کہ ان کے دوران حکومت کا نصب العین یہی تھا کہ ہندوستان برطانیہ کا مقبوضہ ہے اور انگلینڈ کی شاہنشاہیت و استبدادیت کا پنجہ جس قدر مضبوط و زبردست ہوسکے قائم رکھا جائے اور کسی سیاسی تحریک کا ہندوستانیوں کے دل و دماغ میں شائبہ بھی نہ آنے پائے۔ اہل ہند نے ان کی تعلیمی پالیسی کا تو یہی مفہوم سمجھا کہ ہندوستانیوں میں جو سیاسی بیداری انگریزی تعلیم کی وجہ سے پھیل رہی ہے اُسے برٹش گورنمنٹ بہ نظر استحسان دیکھنا نہیں پسند کرتی۔ اس تعلیمی پالیسی کی ابتدا ہی وارنر کی کتاب سٹیزن آف انڈیا Citizen of India کو زبردستی یونیورسٹیوں کے نصاب میں داخل کرا کے شروع ہوئی اور اس کی انتہا انڈین یونیورسٹیز ایکٹ ۱۹۰۴ء پر ختم ہوتی ہے۔ لارڈ کرزن کی ہندوستان میں آخری تقریر کلکتہ یونیورسٹی کے جلسہ تقسیم اسناد کے

موقعہ پر ہوئی جس میں انھوں نے ہندوستانیوں کو یہ کہہ کر بدنام کرنا چاہا کہ ان میں صداقت کی کوئی عظمت نہیں ہے یہی نہیں بلکہ اس پر اکتفا نہیں کیا اور اس حد تک آگے بڑھے کہ ہندوستانیوں کا نصب العین کبھی صداقت نہیں رہا۔ اس کا ترکی بہ ترکی جواب جو امرت بازار پترکا میں شایع ہوا مسز نائیڈو کی جانب سے تھا جس میں اس نیک سرشت عورت نے لارڈ کرزن کی ایک تصنیف سے یہ بتایا کہ لارڈ کرزن نے چین کی ملکہ سے خود جھوٹ بول کر اپنی عظمت جتانا چاہی ہے اور اس جرم کا اقبال عام طور پر خود کیا تھا۔

لارڈ کرزن نے تبت ایک فوج روانہ کی جس کے مصارف ہندوستان کے خزانہ سے ہوئے۔ مگر ان کی اہم ترین غلطی تقسیم بنگال تھی جس پر وہاں کے باشندے بہت برافروختہ ہوئے اور ان کی برافروختگی بالکل حق بجانب تھی آج بھی اس برافروختگی کی دبی ہوئی چنگاریاں موجود ہیں اور ان کے زہریلے اثرات آب و ہوا میں سرایت کیے ہوئے نظر آرہے ہیں لارڈ کرزن چھپے چوری بالکل چور کی طرح ہندوستان سے ۱۹۰۵ء کے آخر میں روانہ ہو گئے اور چلتے وقت اپنے کرتوتوں اور ناعاقبت اندیشیوں کی وجہ سے تمام ملک میں اک آگ سی لگا کر چل دیے انھوں نے جو کچھ کیا اس کا خمیازہ ان کے بعد کے آنے والے وائسرائے کو بھگتنا پڑا۔

دولتِ ہند کے وزرا یعنی ہندوستان کے سکریٹری آف اسٹیٹ

یہ بھی عجب اتفاق زمانہ کہیے کہ اس دَور کے وزرا بھی ایسے ہی پانی کے کھنگالے تھے۔ ہر ایک ان میں سے اسی کوشش میں سرگرم تھا کہ معاملات کو وہ وائسرایوں سے بھی زیادہ گڑبڑ کر دیے اور گوے حماقت میں سبقت لے جاوے۔ کہنے کو تو

سکریٹری آف اسٹیٹ لبرل تھے یعنے مسٹر ہنری فاولر (جو بعد میں وائیکاونٹ ولورہیمپٹن ہوئے۔ یہ نام کے لبرل تھے مگر ٹوریون سے بھی چار ہاتھ آگے رہے۔ ان کے بعد لارڈ جارج ہملٹن وزیر ہند مقرر ہوئے جن کا تقرر ہم ہندیوں کے نقطۂ نظر سے بالکل ایسا ہے جیسے چولھے میں جلنے کے بجائے بھاڑ میں جھونک دیا جائے۔ اس کی دوسری مثال یوں کہیے کہ اگر سر ہنری فاولر نے ہندیوں کو درّے لگائے تو لارڈ جارج ہملٹن نے بچھوؤں کے ڈنک سے ہمیں اذیتیں پہونچائیں۔ ہم ہندیوں کے ساتھ ان میں سے کس کو سب سے کم ہمدردی تھی اس کا پتہ مشکل سے چلایا جا سکتا ہے۔ لارڈ جارج ہملٹن ۸ برس تک وزیر ہند رہے یہ زمانہ ہندوستان کے لیے نہایت سقیم اور آلام کا تھا۔ اس کے بعد مسٹر سینٹ جان بروڈرک (موجودہ ارل مڈلٹن) وزیر ہند ہوئے جن کی قابلیت کی یہ دلیل تھی کہ آپ وزیر جنگ کی حیثیت سے بہت نکمّے ثابت ہوئے اور غالباً اس جگہ سے ہٹا کر ان کی اشک شوئی کرنے کے لیے ان کو وزارت ہند دی گئی۔ ان کی سیاسی دُور اندیشیاں و سیاسی قابلیت اسی سے ظاہر ہوجائے گی کہ انھوں نے دو بڑے کارہائے نمایاں کر ڈالے ہیں (۱) ہندوستان سے مالگذاری کا روپیہ اس انگریزی فوج پر جو جنوبی افریقہ میں رکھی جاوے صرف ہو (۲) انھوں نے لارڈ کرزن کی تقسیم بنگال کی اسکیم کو منظور کیا۔ کچھ یہی نہیں اکثر صوبوں کے گورنر بھی اسی دل و دماغ کے تھے اور ایسے ہی سرپھرے ثابت ہوئے مثلاً لارڈ ہیرس بمبئی میں سر چارلس کراستھویت صوبہ متحدہ میں اور سر چارلس ایلیٹ و سر الگزنڈر میکنزی بنگال میں۔

ہندوستانی جنوبی افریقہ میں

یہ نوعیت اہمیت و وسعت جو اس مسئلہ کو نصیب ہوئی اس وقت کے

معاملات میں یہ مسئلہ زیادہ تر اہم و وسیع ہے۔ ہمارے اہل ملک پر جنوبی افریقہ و برطانوی نو آبادیات میں جو سختیاں ہوئیں اُن سے ہمارے قلوب اسوقت بہت متاثر ہوئے۔ اس مسئلہ کو سب سے پہلے کانگریس نے ۱۸۹۴ء کی مدراس کی کانگریس میں اُٹھایا۔ ۱۸۹۶ء میں اس کو اس قدر اہمیت ہو گئی تھی کہ ایک نوجوان ہندوستانی بیرسٹر جو کسی مقدمہ کے سلسلے میں وہاں گیا تھا مظالم کو بچشم خود دیکھ کر رُک گیا۔ اس نے تمام معاملات سے بخوبی واقفیت حاصل کی پھر کانگریس کو ان تمام باتوں سے آگاہ کرنے اور مسئلہ کی اہمیت جتانے کی غرض سے و نیز ہندوستانی مدبّرین کی صلاح و مشورہ حاصل کرنے کی نیت سے یہاں واپس آیا۔ پانچ برس بعد دوبارہ بھی بیرسٹر ہندوستان اسی غرض و غایت سے واپس آیا۔ اس نوجوان ہندوستانی بیرسٹر کے بارے میں بعد میں بہت کافی آپ کو بتایا جاوے گا (یہ بیرسٹر مہاتما گاندھی ہیں۔ مترجم)۔

کانگریس کی برطانوی کمیٹی

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسی زمانے میں جو ایک انجمن قائم ہوئی اس کے متعلق کچھ بتایا جائے۔ اس انجمن نے بہت سے اہم و مفید کام انگلستان میں انجام دیے ہیں۔ خصوصاً ہندوستانی مطالبات و ہندوستانیوں کے فلاح و بہبود کی اہم خدمات اس کے ذریعہ سے کی گئی ہیں۔ یہ انجمن مسٹر ولیم ڈگبی کی انجمن ہندی سیاسی ایجنسی کی جگہ قائم ہوئی۔ اس کے صدر سر ولیم وڈر برن تھے اور دادا بھائی نوروجی اے، او۔ ہیوم۔ ڈبلو، ایس، کین۔ سر اسمتھ۔ ڈبلو، سی بنرجی اور ہربرٹ رابرٹس (جو اب لارڈ کلانڈ ہیں) اس کے مقتدر ارکان تھے۔ کئی سال بعد سر ہنری کاٹن بھی اس میں شریک ہو گئے۔ سر ولیم وڈر برن کی قیادت میں اس انجمن نے براہ راست و نیز انڈین پارلیامنٹری کمیٹی

کی امداد سے ہندوستان کے لیے ماہ بماہ و سال بہ سال کارہائے نمایاں انجام دیے۔ انڈیا (ہندوستان) نام کا ایک رسالہ بھی اس نے جاری کیا۔ جو پہلے ماہوار تھا اور بعد میں ہفتہ دار ہو گیا جس کے پہلے ایڈیٹر واقفکار زمانہ مسٹر ولیم ڈگبی تھے اس کے ایڈیٹروں کی فہرست میں مسٹر گارڈن ہیوارٹ (جو لارڈ ہیوارٹ ہیں اور انگلستان کے چیف جسٹس ہیں) کا نام نامی ملتا ہے آپ اس کے نہایت مشہور و معروف اڈیٹر تھے۔

سر ولیم وڈر برن اُن تمام کاموں کے جو ہندوستان کے لیے انگلستان میں کیے گئے ہیں سر ولیم روح رواں تھے۔ آپ اپنے کو ہندوستان کا "وراثتی خادم" کہا کرتے۔ آپ نے بمبئی میں ۲۵ برس آئی، سی، ایس افسر کی حیثیت سے رہ کر بلا تفریق مذہب و ملت ہندوستانیوں کے ساتھ اپنی انتہائی ہمدردی کا ثبوت دیا اور ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد ۲۹ برس جو آپ زندہ رہے اس کا ہر لمحہ و ہر منٹ آپ نے ہندوستان کی خدمت میں صرف کیا۔ یہی نہیں کہ اپنا وقت ہی صرف کریں بلکہ نہایت فراخدلی سے ایسے کاموں پر اپنا روپیہ بھی صرف کرتے رہے۔ آپ کی ایک ہزار پونڈ سالانہ کی پنشن کا پیسہ پیسہ جو آپ کو ہندوستان کے مالیات سے ملتی رہی ہندوستان کے کاموں پر صرف ہوا کیا اور اس میں شک نہیں کہ پنشن کی ۲۹ برس مدت میں انھیں کاموں پر آپ کا کئی لاکھ روپیہ اٹھا آپ ، برس تک پارلیامنٹ کے ممبر رہے اور یہ تو ایک امر مصدقہ و مسلمہ ہے کہ آپ کی شریف النفسی کسی دوسرے ممبر میں کبھی مل ہی نہیں سکی۔ ۱۸۸۹ء میں بمبئی کانگریس کی صدارت کے بعد آپ صرف دو بار ہندوستان واپس آئے ایک اُس وقت جب کانگریس دوبارہ بمبئی میں سر ہنری کاٹن کی صدارت میں

۱۹۰۴ء میں منعقد ہوئی اور دوسری بار جب ۱۹۱۰ء کی الہ آباد کانگریس میں آپ خود صدر منتخب ہوئے تھے۔ آپ کے بارے میں سر سرندر ناتھ بنرجی نے خوب کہا ہے۔ "انگریزی افسر کے روپ میں آپ سچے ہندوستانی محب وطن ہیں" اگر کہیں زیادہ باطل پرست زمانہ میں آپ پیدا ہوئے ہوتے تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آپ کو اہل زمانہ کسی بڑے ہندو مہاتما کا اوتار خیال کرتے جو ہندوستانیوں کی بھلائی کے لیے انسانی شکل وصورت میں بھیجے گئے ہیں"۔ مسٹر گوکھلے آپ سے بہت زیادہ واقف تھے اور اُن کے دل میں آپ کی انتہائی محبت وعظمت تھی۔ خود سر ولیم کے دل میں مسٹر گوکھلے کے لیے وہی محبت وشفقت تھی جو باپ کو بیٹے کے ساتھ ہوتی ہے۔ مسٹر گوکھلے کا قول ہے "یہ وہ بلند مرتبت وعالی قدر موجودہ زمانے کے رشی کی ہستی ہے جس کے محامد ومحاسن جس کی عظمت وجلالت جس کی بزرگی وبرگزیدگی جس کی بڑائی ونیکی الفاظ ادا کرنے سے قطعی قاصر ہیں۔ بس یہی ممکن ہے کہ حتی المقدور اس ہستی کی محبت وعظمت کی جاوے اور اس کو ذہن نشین کرکے خاموشی میں یاد الٰہی کے لیے نصب العین قرار دیا جائے"۔ اب اس مناسب تعریف کے بعد میں آپ کی تعریف کرنے سے قطعی طور پر قاصر ہوں۔

سر برآوردہ مدبّرین کانگریس کے ابتدائی بیس برس کے سر برآوردہ کارکنان ومدبّرین کے بارے میں اب میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ بلا لحاظ کسی امر کے اس میں کوئی کلام نہیں ہوسکتا کہ ان سب کے سرگروہ وسردار سر ولیم ودڈبرن تھے جن کے بارے میں اظہار عقیدت ابھی ابھی کیا جاچکا ہے۔

دادا بھائی نوروجی قسام ازل نے کچھ یہ ناموری دادا بھائی کے مقدر میں

لکھی تھی کہ کانگریس کی پیدائش سے ۴۰ برس پہلے سے آپ نے ہندوستان میں منظم سیاسی بیداری کی داغ بیل ڈالی اور اس فریضہ کو آپ نے ۴۰ برس تک جس انہماک - تدبر و بے توجی سے انجام دیا ہے اس کی دوسری مثال تاریخ ہند شاید ہی پیش کر سکتی ہے (دس برس اس کے علاوہ آپ اور زندہ رہے مگر بالکل الگ تھلگ رہے) میں اس نوجوان جماعت کے لیے اُس گرم جوشی سے دادا بھائی کی تصنیف "غربت و ہندوستان میں غیر برطانوی سلطنت" کی بابت سفارش کرنے سے قاصر ہوں جس کی یہ کتاب مستحق ہے خصوصاً اُس نوجوان جماعت کے لیے جو ہندی سیاست سے واقف ہونا چاہتی ہے - اس کتاب کے مطالعہ سے یہ ضرور معلوم ہوگا کہ دادا بھائی نے اس راستہ کو کس قدر خس و خاشاک سے پاک کیا اور ان کے بنائے ہوئے شاہراہ پر کس حد تک ہم اپنی سیاسی سرگرمیوں میں زمانہ حال تک گامزن رہے ہیں - ہندی دولت اور اس کی لوٹ دادا بھائی کا خاص مضمون رہا جس پر آپ نے بے انتہا تقریریں کی ہیں اور آپ نے غلامی کے نقائص سبھوں سے زیادہ بتائے ہیں - یہی نہیں آپ کو تمام مضامین پر کلی قدرت حاصل تھی - آپ نے ۶۱ برس متواتر ہندوستان و انگلستان میں انتہائی ایثار و جانفشانی سے مادرِ وطن کی خدمت انجام دی ہے - آپ اپنے اس مبارک فریضے سے کسی حالت میں نہیں رُکے - مخالفت کی تیز و تند آندھیاں چلیں - زمانے نے نامساعدت کی - دقتوں کے پہاڑ سامنے حائل ہوئے مگر آپ کی مردانہ ہمت کے سامنے سب ہیچ تھا - آپ کی وہ مردانہ ہمت تھی جس کے سامنے نوجوانوں کی ہمتیں آج شرم سے پانی پانی ہوں گی - سیاسی تخیل میں آپ عرصہ تک اعتدال پسند تھے مگر ناکامیوں نے آخر میں آپ کو مجبور کر دیا -

اور آپ کی زبان زیادہ سخت و درشت ہوگئی۔ باوجود اس کے آپ نہایت درجہ شریف النفس تھے اور آپ کی رائے بہت صائب ہوتی تھی۔ آپ نے کسی سے کبھی دشمنی مول نہیں لی آپ کے ذاتی محاسن آپ کی غایت درجہ بلند قومی وسیاسی خدمات اس کی مقتضی ہیں کہ آپ کے اہل وطن آپ کی زندگی کو نصب العین قرار دیں اور آپ کے بتائے ہوئے شاہراہ پر نہایت ادب وعزت سے آپ کی عظمت کا لحاظ رکھتے ہوئے چلنے کی کوشش کریں۔

مہادیو گووند راناڈے

دوسرا درجہ مہادیو گووند راناڈے کا ہے ان دونوں میں ایک روحانی تعلق تھا اور آپس میں بیحد محبت تھی۔ راناڈے دادابھائی کو پروفیسر دادابھائی کہا کرتے اسلیے کہ جب راناڈے اسکول میں تعلیم پارہے تھے اس وقت دادابھائی پہلے الفنسٹن کالج بمبئی میں اور پھر لندن یونیورسٹی میں پروفیسر تھے۔ اگر دادابھائی کو ۱۹ صدی کا سب سے بڑا محب وطن کہا جائے تو بیشک راناڈے کو سب سے بڑا فلسفی کہنا بالکل درست ہے۔ ابھی آپ طالب علم ہی تھے کہ آپ کی آیندہ زندگی کی کامیابیاں نظر آرہی تھیں۔ جب آپ بمبئی یونیورسٹی کے ایم' اے میں شریک رہے تو یہ مشہور ہے کہ سرالگزنڈر گرانٹ نے اڈنبرا یونیورسٹی کے طلبہ کو آپ کے جوابات کو نمونتاً بھیجا تھا۔

راناڈے کا دماغ عدیم المثال تھا۔ آپ نہایت جفاکش وغایت درجہ ذہین تھے آپ کا مطالعہ نہایت درجہ وسیع تھا اور مختلف علوم وفنون میں آپ کو ید طولیٰ حاصل تھا۔ آپ نہایت عمیق النظر فلسفی ومضطرب دل والے محب وطن تھے۔ اس کے باوجود کہ آپ کی پوری زندگی سرکاری ملازمت میں گذری جو ایک رکاوٹ تھی۔ آپ ایک مستعد سیاسی رہنما۔ ایک مذہبی مصلح

اور اس سے بڑھ چڑھ کر ایک پرجوش معاشرتی مجدد تھے۔ آپ ہندی اقتصادیات کے اپنے زمانے میں سب سے بڑے فاضل تھے اور علم تعلیمات میں آپ کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ آپ کی ذات وہ چشمۂ فیض تھی جس سے نوجوانوں کا ایک گروہ جو ہمہ وقت آپ کو گھیرے تھا ہمیشہ سیراب ہوتا رہا۔ ان محامد و محاسن کے ہوتے ہوئے بھی آپ کی زندگی نہایت سادہ تھی۔ آپ نہایت درجہ متواضع منکسر مزاج۔ کریم النفس و خلیق تھے اور یہی خصائل حقیقی عظمت کے جزو لاینفک ہیں۔ رانا ڈے کی تصنیف۔ "ہندی اقتصادیات پر مضامین'' مذہب ومعاشرت پر مضامین" مرہٹوں کا عروج" اس کی مستحق ہیں کہ انھیں ہر طالب علم و فاضل سیاسیات ضرور پڑھے۔

فیروز شاہ مہتا

اس کے بعد سر فیروز شاہ مہتا کا نمبر ہے۔ آپ کا چہرہ مہرہ و طرز طریقہ سب شاہانہ تھا اور قدرت نے آپ کو تعجب انگیز ذہانت تفویض فرمائی تھی۔ آپ ۱۸۶۸ء میں بیرسٹر ہو کر ولایت سے واپس ہوئے اور آپ نے اپنے اس علم کو جسے دادا بھائی نوروجی کو آپ کی طالب علمی کے زمانے میں سکھایا تھا ملک کی خدمت میں تا زیست (۱۹۱۵ء) صرف کیا۔ آپ کی سیاسی خدمات نہایت درخشاں ہیں۔ یہاں ہم آپ کی آئین پسند طرز خدمت کی ایک مثال پیش کریں گے۔ آپ بمبئی کارپوریشن کے ممبر ۱۸۶۸ء میں ہوئے اور صرف ۲ برس بعد جب آپ کی عمر ۲۶ برس کی تھی آپ نے بمبئی ایسٹ انڈیا ایسوسی ایشن کے سامنے ایک مضمون پڑھا۔ آپ نے جو دستور کارپوریشن کے لیے اس مضمون میں تجویز فرمایا تھا وہی کُل کا کُل گورنمنٹ و کاؤنسل نے منظور کر لیا اور تقریباً اسی دستور کی آج بھی پابندی کی جارہی ہے اور وہی ایک بہت بڑا میونسپلٹی کا دستور ہے۔ کانگریس جلسوں میں بمبئی کاونسل کے اجلاسوں میں اور وائسرائے کی کاونسل کی

میٹنگوں میں جہاں کہیں آپ شریک رہے آپ نے ہمیشہ نہایت درخشاں خیالات کا اظہار کیا جو نہ صرف بحیثیت الفاظ کے درخشاں تھے بلکہ معنویت اور عملی تدبر کی بہترین مثال تھے۔ آپ بہت بڑے مقرر تھے اور آپ کے مقابل کا اب تک کوئی مناظر و مقرر ہندوستان کی سرزمین نے پیدا نہیں کیا۔ خوف و ہراس سے ناآشنا آپ کو قدرت نے قائد بنا کر پیدا کیا تھا۔ ڈاکٹر رتھ فورڈ جو ایک لبرل ممبر پارلیامنٹ کے تھے اور جو ہندوستان میں ۱۹۰۶ء میں آئے "تنیجسٹر گارجین" میں تحریر کرتے ہیں اگر فیروز شاہ کسی آزاد ملک میں پیدا ہوئے ہوتے تو وہ سیاسی کابینہ (وزارت) میں سب سے آگے ہوتے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر وہ انگلستان میں پیدا ہوئے ہوتے تو وزیر اعظم ہوتے مگر چونکہ وہ ایک غلام ملک میں پیدا ہوئے تھے اس لیے ان پر لغو اعتراض کی بوچھار بھی ہوا کی۔

گوپال کرشن گوکھلے

اس سلسلہ میں دادا بھائی نوروجی۔ راناڈے۔ سر فیروز شاہ مہتا کے نام کے بعد مسٹر گوکھلے کا نام نامی آتا ہے۔ دادا بھائی کے متعلق آپ کی رائے پہلے درج کی جاچکی ہے۔ راناڈے آپ کے ۱۲ برس تک گرو تھے اور سر فیروز شاہ مہتا کی اصابت رائے وخلوص آرا میں تو آپ کو اس حد تک اطمینان و اعتماد تھا کہ آپ اکثر کہا کرتے "میں فیروز شاہ کے ساتھ رہ کر غلطی کرنا بمقابلہ اس صحت کے جو میں ان کے بغیر کروں زیادہ پسند کرتا ہوں"۔

آپ کی طالب علمی کا زمانہ انتہائی افلاس و آلام کا گذرا ہے مگر ان میں وہ جوہر موجود تھے جن کے ذریعہ سے یہ دنیا میں کافی آرام و آسائش کی زندگی بسر کرسکتے تھے اس کے باوجود بھی بیس[۲] برس سے کم عمر میں آپ نے جان بوجھ کر

ایثار و افلاس کی زندگی اختیار کی۔ آپ کا نصب العین ہمیشہ بلند تھا مگر نصب العین عملی تھا۔ آپ کے خود الفاظ ہیں کہ "میں اپنے اہلِ وطن کے بارے میں ایسی امیدیں رکھتا ہوں جس کی کوئی حد نہیں" تاہم آپ کا طرزِ سیاست نتیجہ خیز تھا جس کے متعلق مسٹر اسپنڈر کا قول ہے "بڑے بڑے میں خیالات و حالات کے لحاظ سے تبدیلیاں پیدا کرنا ہی تدبر کی جان ہے"۔ مسٹر گلیڈ سٹون کی طرح مسٹر گوکھلے کو اسکا احساس تھا کہ ہر معاملہ ہر زمانے کے لیے نہیں ہے اور آپکو "ناممکنات و قابل حصول" نظریوں میں امتیاز کی لاثانی قدرت حاصل تھی۔ لارڈ مارلے نے کہا ہے کہ مسٹر گوکھلے کو ایسا سیاسی دماغ ودیعت ہوا تھا اور انتظامی ذمہ داریوں کی ایسی فراست حاصل تھی جس کی مثال دوسروں میں نہیں ملتی۔ آپ کے خیالات۔ الفاظ و افعال میں ایک مناسب و موزوں ارتباط تھا اگر آپ نے کوئی بات سوچ لی تو دنیا کی کوئی قوت اس سے ہٹا نہ سکتی۔ آپ اُس نظریہ کو مردود و مذموم تصور کرتے "کہ نتیجہ کام کی بھلائی و برائی کی کسوٹی ہے" بلکہ آپ کے نزدیک طریقہ بذات خود اس فعل کا حقیقی انعام تھا۔ زندگی میں جتنے معاملات درپیش ہوئے آپ نے ان سب میں نہایت احتیاط سے کام لیا۔ آپ نہایت روشن دماغ۔ قوی الذہن۔ جفاکش تھے جس کی وجہ سے آپ کے معلومات ہمیشہ صحیح تھے آپ کا علم نہایت وسیع تھا آپ کی بصیرت نہایت عمیق تھی۔ آپ کا طرزِ ادا لارڈ ایسکوتھ کی طرح صاف، شستہ و سلیس تھا۔ آپ کی احتیاط و دماغی ایمانداری کی یہ حالت تھی کہ آپ کسی بات پر اُس وقت تک اظہارِ خیال نہ کرتے جب تک کہ خود اپنے ذہن میں جرح و قدح خوب نہ کر لیں اور اس نتیجہ پر نہ پہونچ جائیں کہ اب اس کی تردید ناممکن ہے۔ آپ نے کبھی اپنی قوتِ دماغی کی کمزوری کا ثبوت نہیں دیا۔ آپ ہمیشہ بہت غور و تفحص کے بعد کسی نتیجہ پر پہونچتے۔ چاہے آپ کو کتنی ہی غیر ہردلعزیزی کا سامنا

کیوں نہ کرنا پڑے آپ اُس نتیجہ پر پہونچنے کے بعد ہرگز ایک قدم بھی پیچھے نہ ہٹتے۔ آپ اپنے لیے متحرک ہونا ذی فہم ہونے سے زیادہ بہتر جانتے تھے۔ آپ کی وہ لاجواب ولاثانی شخصیت تھی کہ آپ کی موجودگی میں آپ سے کم عمر حضرات اپنی کم مائگی محسوس کرتے مگر دل سے عظمت کرتے۔ کیا مجال کہ آپ کی نسبت کوئی رکیک یا ذلیل خیال کسی کے دل میں پیدا ہو سکے۔ آپ کے دلی دوستوں کا دائرہ محدود تھا مگر پھر بھی جن کو یہ شرف حاصل تھا اُن کے دل سے یہ بات کبھی بھول نہیں سکتی کہ آپ کے مکالمات آدمیوں اور خبروں کے متعلق کس قدر لطیف۔ دلچسپ ومعنی خیز ہوتے تھے۔ مجھے اپنی بابت یاد ہے کہ جب میں آپ کے سامنے بیٹھتا اور آپ کی باتیں سنتا تو یہی معلوم ہوتا کہ آپ کی زبان سے پھول جھڑتے ہیں۔

یہ کہنا کہ آپ زیادہ محب وطن تھے یا زیادہ پرمغز وقابل تھے نہایت دشوار ہے آپ نے ۳۱ برس کی عمر میں انگلستان میں شاہی کمیشن کے سامنے گواہی دے کر اپنی خداداد ذہانت ومسلم الثبوت قابلیت کا سکہ وہاں کے مدبرین کے قلوب پر بٹھا دیا جن کی رائے تھی کہ ایسے فاضل بہت شاذونادر ہو سکتے ہیں۔ ہندوستانی مجلس قانون ساز کے آپ سب سے قابل وبڑے ممبر تھے اور اپنی ممبری کے ابتدائی چار سال میں آپ نے لارڈ کرزن ایسے بیدار مغز واقفِ اصول مقننہ کے مقابلے میں جو تن تنہا جدوجہد کی ہے اس کی دوسری مثال تاریخ نہیں پیش کر سکتی۔ یہ ظاہر ہے کہ اکثر لارڈ کرزن ایسے شاہنشاہیت کے دلدادہ ومسٹر گوکھلے ایسے نڈر محب وطن کے درمیان شکر رنجیاں بھی پیدا ہوا کیں پھر بھی لارڈ کرزن آپ کی انتہائی عظمت کرتے اور آپ کی قابلیت کے بے حد معرف تھے۔ آپ کو ایک بار لارڈ کرزن نے یوں لکھا "قدرت نے آپ کو

عدیم المثالی قابلیت سے مالا مال کیا ہے جس کو آپ نے اپنے ملک کی خدمت کیلئے بلا کسی تعلق کے وقف کر رکھا ہے"۔ آج بھی شاید ہی کوئی ایسا سیاسی مسئلہ ہے جس کے حل کرنے میں مسٹر گوکھلے کی کسی نہ کسی گرانقدر اسپیچ سے مدد نہ مل جاتی ہو۔

آپ نے اپنے انگلستان کے متعدد دَوروں میں وہاں کے مدبرین وسیاست دانوں پر وہ اثرات قائم کر رکھے تھے کہ مسٹر مسنگھم نے جو "نیشن" کے بہت مستند و باوقعت ایڈیٹر تھے مجھ سے خود کہا کہ انگلستان کے سیاست دانوں میں مسٹر گوکھلے کی جوڑ کا کوئی سیاست دان نہیں تھا اور اس کا بھی اعتراف کیا کہ گوکھلے مسٹر اسکوتھ سے زیادہ قابل وواقف کار تھے اور یہ بھی بتایا کہ لارڈ مارلے اس وجہ سے بحیثیت سکریٹری (وزیر ہند) کے کامیاب ہوئے کہ انھوں نے گوکھلے کے ہدایات پر عمل کیا۔ اور یہی مارلے کی کامیابی کا راز تھا۔ آپ کی تمام درخشاں ملکی خدمات میں سب سے زیادہ مفید۔ گرانقدر خدمت وہ ہے جو ۱۹۰۵ء میں سرونٹ آف انڈیا سوسائٹی کی صورت میں رونما ہوئی جس کا تخیل ونصب العین بہت بلند وبرتر ہے۔ اس کے نصب العین کی تشریح مسٹر گوکھلے نے اپنی بنارس کانگریس کے صدارت کے خطبہ میں جو انجمن مذکورہ کے قیام کے ۶ ماہ بعد منعقد ہوئی یوں فرمائی ہے۔ "مادر وطن کی خدمت کا وہ ذوق وشوق۔ اس قدر گہرا وعمیق تعلق کہ اس کا محض ایک خیال پھریری پیدا کردے اور اس کا حس انسان کو اس کی معرفت سے آشنا کردے"۔

اس وقت مسٹر گوکھلے صرف ۳۹ سال کے تھے پھر بھی کانگریس کے جملہ صدر کے زمرہ میں ان کا شمار نہایت عقلمند۔ سنجیدہ صدر کی حیثیت سے ہوتا ہے۔ آپ کی تقریریں نہایت عظیم الشان ومعرکۃ الآرا ہوتیں مگر آپ کی شخصیت ان تقریروں سے کہیں زیادہ عظیم الشان۔ بالا وبرتر تھی۔ اگر کوئی مسئلہ زیر غور ہوتا اور

اس پر آپ کو تشویش ہوتی تو آپ کو نیند نہ آتی۔ آپ کے پیش نظر آپ کی تندرستی ہرگز نہ تھی جو خیال آپ کو مضطرب کئے رہتا وہ ملک کی خدمت کا خیال تھا جو اُٹھتے بیٹھتے۔ سوتے جاگتے آپ کو بے چین کئے رہتا۔ مجھے آپ نے ایک مقولہ بتایا ہے یعنے محب وطن ہیرو ہے" سچ تو یہ ہے کہ آپ سے بہتر کوئی دوسرا محب وطن نہیں ہو سکتا اور ہم میں سے بہتوں کے آپ بیشک ہیرو ہیں۔

مادرِ ہند کو اگر رانا ڈے نے گوکھلے ایسا شاگرد دیا۔ تو گوکھلے نے بھی ہندستان کو سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی دی جس میں مسٹر سری نواس شاستری و پنڈت ہردے ناتھ کنزرو ایسے اصحاب شریک ہیں۔ صرف گذشتہ ہفتے سے پہلے ایک مسٹر گوپال کرشن دیودھار بھی تھے جن کی افسوسناک موت نے ہمیں اس مقتدر ہستی کے خدمات سے محروم کر دیا آپ نہایت فیاض تھے اور تکلیف و مصائب کے وقت اپنے احباب کی مصیبت میں ہمیشہ کام آتے۔ آپ کی موت ہم سب کی بدبختی کی ایک ناقابل تلافی علامت ہے۔ اور اس پر جس قدر افسوس کیا جائے کم ہے۔ مسٹر گوکھلے نے مذکورہ بالا سوسائٹی کے سرنامہ میں اس کے نصب العین کی ان الفاظ میں تشریح فرمائی ہے۔

"ہمارے ہم وطنوں کی ایک کافی تعداد (مادرِ وطن کی خدمت کے لئے) اُسی جذبہ و شوق سے تیار ہو جس طرح مذہبی کام کیا جاتا ہے۔ خدمت خلق کی زندگی کو روحانیت کے رنگ میں رنگ دینا چاہئے اور حبِ وطن اس طرح دلوں میں جگہ کرے کہ اسکے مقابلے میں اور کام ہیچ نظر آدیں۔ اس خدمت کے انجام دینے والوں کے دلوں میں ایسا جذبہ وطن پرستی ہو جس کو مادرِ وطن کے نام پر ایثار کرنے میں ہر ہر قدم پر لطف ملے۔ اُن کے سینے اس جذبے سے اس قدر معمور ہوں کہ مصائب و تکالیف کے موقع پر قدم نہ ڈگیں اور اُن کے قلوب کو

قدرت خدا پر وہ بھروسہ حاصل ہو جائے کہ کسی چیز سے اس میں شبہ یا احتمال نہ پیدا ہو سکے - ان اوصاف سے متصف ہونے کے بعد کارکنوں کو اپنے فرائض کے انجام دینے کے لئے تیار ہونا چاہئے تاکہ وہ حقیقی مسرت جو اپنے وطن کی خدمت کرنے میں حاصل ہوتی ہے انھیں نصیب ہو"

مسٹر گوکھلے نے سر بھیشم آینگر کے بارے میں ایک بار ارشاد فرمایا کہ ایسے شخص کا وجود جو اپنے پیشہ میں اس قدر بلند و بالا ہے بذات خود ملک کی ایک اہم خدمت ہے اس لئے کہ ایسے اشخاص ملک کو دنیا کی نظروں میں گرانقدر بنا دیتے ہیں۔

مجھے مسٹر گوکھلے کی خدمت میں وہی شرف حاصل تھا جو ایک شاگرد کو اپنے اُستاد کی خدمت میں حاصل ہوتا ہے - باوجود اس تعلق کے جو مجھے اس ذات گرامی سے حاصل ہے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ جو کچھ کہا گیا ہے اس میں کسی مبالغہ یا غلو سے کام نہیں لیا گیا ہے - آج کوئی ۲۰ برس ہوتے ہیں کہ یہ برگزیدہ ہستی ہم سے علیحدہ ہو چکی ہے - اس مدت میں آلام و مصائب - بُرا اور بھلا - کٹھن اور آسان ہر طرح کا وقت ہمارے ملک پر پڑا - بہتیرے ایسے موقعے درپیش آئے جہاں ہمارے قومی رہنماؤں کو تدبر کی اشد ضرورت پڑی - ان اوقات میں اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارے سیاسی رہنماؤں میں سے بہتیروں نے زبردست ایثار و قابل تقلید قربانیوں کے ساتھ مادر وطن کا ساتھ دیا - ان کی ایثار و قربانیاں بیشک قابل صد آفریں وصد ہا ستائیش ہیں مگر خطا معاف پھر بھی وہ بات کہاں گوکھلے کے بعد گوکھلے نہ ہوا۔ مادرِ وطن کی گود اس سپوت بلکہ قابل افتخار خلاؤں سے اب تک خالی ہے کوئی بھی اس جوڑ کا اس سرزمین سے نہ اُٹھا - اور یہ بات تو عام ہے کہ ہم میں سے وہ جنھیں مسٹر گوکھلے کے ساتھ کام کرنے کا فخر حاصل رہا ہے اس ۱۰ - ۱۵ - برس کی مُدت میں اس برگزیدہ ہستی و مجسمہ تدبر و سیاست کی ضرورت برابر محسوس کرتے رہے ہیں

اور ہمیں اُن کے ساتھ کے ایک گھنٹہ کی صحبت کے لطف کو یاد کرکے از حد افسوس ہوتا ہے۔ بھلا اس مجسمۂ اخلاق اس پیکرِ تدبّر کی باتیں کب کسے نصیب ہوسکتی ہیں!

ڈنشا ایڈلجی واچا

صوبۂ بمبئی کے حالات کا بیان قطعی اس وقت تک نا تمام رہے گا جب تک کہ سر ڈنشا ایڈلجی واچا کے حالات کا ذکر مودبانہ طور پر نہ کرلیا جائے۔ تین نامور و نامدار پارسی رہبروں میں سے سر ڈنشا بیشک ایسے رہبر ہیں جنھوں نے ملک کی خدمت کو فرض اولین بنا رکھا تھا۔ آپ کی وطنی سرگرمیاں گوناگوں ہیں۔ آپ کی مصروفیتوں اور خدمات کا اندازہ یوں ہوسکتا ہے کہ آپ صحافت سے دلچسپی رکھتے تھے اور مختلف و متعدد اخبارات میں مضامین لکھتے۔ آپ کے مضامین نہایت مشرح اور صاف ہوتے۔ آپ بمبئی صوبہ کی انجمن کے سکریٹری بھی تھے اور نیز کانگریس کے سکریٹری۔ متعدد انجمنوں کے جن کا کام فلاح عامہ تھا اس کے سرگرم ممبر بھی تھے۔ آپ کا یہ خاصہ تھا کہ اپنے سے کم عمر محبان وطن کے معین و مددگار رہتے۔ آپ کو اقتصادیات، مالیات کے مسائل میں اعلیٰ درجے کی مہارت حاصل تھی اور تقریباً دو نسلوں تک آپ نے انتہائی سرگرمی، جانفشانی و دلسوزی سے ان معاملات میں کام کیا۔ آپ کی تحریریں اور تقریریں سیاسیات ہند کے طلبہ کے لئے معلومات کی کان ہیں اس وقت آپ کی عمر ۹۲ برس کی ہے مگر پھر بھی آپ اُسی انہماک سے ان مسائل میں وہی دلچسپیاں قائم رکھے ہوئے ہیں (مترجم۔ آپ کا اب انتقال ہوگیا ہے)۔

آج سے دو برس قبل جب میں آپ سے ملا تھا آپ نے مجھ سے ارشاد فرمایا کہ سنہ ۱۸۶۳ء سے آج تک آپ نے "اکنامسٹ" (اقتصادیات پر ایک مشہور عالم رسالہ ہے) کے کسی نمبر کا پڑھنا ناغہ نہیں کیا بلکہ برابر مطالعہ فرماتے رہے ہیں۔ آپ سنہ ۱۹۰۱ء کی کانگریس کے بمقام کلکتہ صدر ہوئے اور اس میں تو کوئی کلام ہی نہیں ہوسکتا کہ

آپ نے اپنی سرگرم وطویل زندگی میں ہندی سیاسیات کے میدان میں بڑے بڑے اور اہم کام انجام دئے ہیں اور آپ کا مرتبہ بہت اعلیٰ و ارفع ہے ۔

دیگر رہنما صوبۂ مغربی کے مقتدر رہبروں کی فہرست میں جنھوں نے اہم فرائض انجام دئے ہیں بدرالدین طیّب جی ۔ کاشی ناتھ ترمبک تلنگ ۔ بال گنگا دھر تلک ۔ رحمت اللہ محمد سیانی (جو ۱۸۹۶ء کی کانگریس کے صدر رہے)۔ جھاویری لال اُمیشنکر یاجنک ۔ نرائن گنیش چندر ورکر۔ گوکل داس ۔کہن داس پارکھ۔ ہرمزجی اردشیر وادیا ۔ کے ، این بہادر جی ۔ بھال چندر کرشنا ۔ داجی اباجی کھرے۔ چمن لال ہری لال سیتلواد ۔ رگھوناتھ پندرنگ کرندکار ۔ نراین وشنو گوکھلے ۔ نرائن مہادیو کارتھ ۔ امبالال سیکر لال ڈیسائی ۔ ہری سیتا رام ڈکشتھ ہیں مسٹر طیّب جی پہلے مسلم لیڈر تھے جو کانگریس میں شریک ہوئے آپ بہت زبردست مقرر اور بڑے مشہور ایڈوکیٹ تھے ۔ ہائیکورٹ کے جج ہونے کے بعد بھی جیسا کہ سر فیروز شاہ مہتا نے خود ارشاد فرمایا ہے ۔ آپ ایسے موقعے پیدا کیا کرتے کہ آزادی سے کھُلم کھُلا اپنے کانگریسی ہونے کا اظہار کیا کریں یہاں تک کہ ججی کی کرسی پر سے آپ نے اپنے کانگریسی ہونے کا فخر کے ساتھ اعلان فرمایا ہے ۔

کاشی ناتھ ترمبک تیلنگ بڑے فاضل ۔ قانون داں ۔ سیاست داں اور نیز ماہر تعلیمات تھے ۔ آپ عظیم الشان مقرر و مناظر بھی تھے ساتھ ہی ساتھ آپ کی علمی قابلیت یگانۂ روزگار تھی اور آپ کی قوت دماغی شہرۂ آفاق تھی ۔ آپ کی طالب علمی کا زمانہ ایسا درخشاں تھا کہ مشکل سے کوئی مثال اس کی مل سکتی ہے۔ جس کا اختتام صرف ۱۹ برس کی عمر میں ہوا اس کے بعد پیشہ وکالت میں تو وہ نمایاں ترقیاں آپ کو نصیب ہوئیں کہ جن کی تعداد کا شمار بھی مشکل ہے ۔ انڈین ایجوکیشن کمیشن کی ممبری آپ کو ۳۲ برس کی عمر میں دی گئی اور اس کے ۴ برس بعد

آپ کو بمبئی کی مجلس قانون ساز کا ممبر مقرر کر دیا گیا۔ بمبئی ہائیکورٹ کی ججی آپ کو ۳۹ برس کی عمر میں ملی اور اس کے دو برس بعد آپ یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی ہوگئے۔ مگر افسوس تو اس بات کا ہے کہ آپ نے صرف ۴۳ برس کی عمر پائی۔ معلوم نہیں آپ کو فیضان رحمت نے کیا کیا قوتیں ودیعت فرمائی تھیں۔ اگر اس کا اندازہ کچھ ہو سکتا ہے تو "تلنگ اسکول آف تھاٹ" (مسٹر راناڈے کی ایک تقریر جو ہندو یونین کلب بمبئی میں ۱۸۹۰ء میں ہوئی تھی اور جو مسٹر راناڈے کے مضامین میں ان کے مذہبی و معاشرتی مضامین کے ضمن میں مل سکتی ہے) سے کچھ کچھ ہو سکتا ہے۔

مسٹر سیانی کانگریس کے دوسرے مسلم صدر ہوئے ہیں۔ آپ نے اپنے خطبہ صدارت میں "مسلمانوں کا تعلق ہندوستان سے" کے تحت میں جو بصیرت افروز خیالات ظاہر فرمائے ہیں ان کے بارے میں یہ بلا کم و کاست کہا جا سکتا ہے کہ ایسا پرمغز، مختصر و غیر جانبدارانہ بیان اس مضمون پر آج تک کسی اور کا دیکھنے میں نہیں آیا۔

مسٹر وجہنگ بھی اپنی معلومات و معنویت خیالات کے لحاظ سے برابر کا درجہ رکھتے تھے اور آپ کے مضامین جو سنہ ۱۹۰۲ء میں شایع ہو چکے ہیں آج بھی پڑھنے کے قابل ہیں۔ سر گوکل داس پارکھ نے تو قحط سنہ ۱۹۰۰ء کے پہلے اور بعد کی جو پالیسی مالگزاری کے متعلق رہی ہے اس کے بارے میں وہ کام کئے کہ گورنمنٹ کو مجبور ہو کر اپنی پالیسی ہی بدل دینا پڑی۔ قحط کی حالت سے فائدہ اٹھا کر بمبئی گورنمنٹ نے ضابطہ مالگزاری میں سنہ ۱۹۰۱ء میں ایک ترمیم پاس کی اس پر اظہار مخالفت کی غرض سے پہلی بار کاونسل سے کچھ ممبر نکل آئے ان نکلنے والوں کے قائد سر فیروز شاہ مہتا تھے جن کے ساتھ مسٹر گوکھلے۔ کھرے۔ سر گوکل داس پارکھ و سر بھالچندر کرشنا تھے۔ سر نرائن چندر ورکر ڈیلیگیٹ ہو کر مسٹر من موہن گھوش و سالم راماسوامی مدلیر کے ہمراہ سنہ ۱۸۸۵ء میں انگلستان گئے۔ آپ کئی برس تک بمبئی پریسیڈنسی ایسوسی ایشن کے سکریٹری بھی رہے

اور سنہ ۱۹۰۱ء میں آپ کانگریس کے صدر بھی منتخب ہوئے۔ ڈاکٹر بہادر جی سنہ ۱۸۹۲ء میں کانگریس میں آکر شریک ہوئے جن کی شرکت کی وجہ سے انڈین میڈیکل سروس کے نظم ونسق کے مسئلہ نے ایک نیا زور پکڑا اور آپ نے اس معاملہ میں غیر معمولی قابلیت اور دلچسپی کا ثبوت دیا۔ اور اس غیر معمولی قابلیت کا یہ اثر ہوا کہ آپ کو ویبی کمیشن کے سامنے شہادت کے لئے مدعو کیا گیا۔ آپ کی عمر ۳۰ سال سے کم رہی ہوگی کہ آپ نے سنہ ۱۸۹۰ء میں انتقال کیا۔ آپ نے جن اصلاحات کی جانب گورنمنٹ کو توجہ دلائی تھی افسوس ہے کہ ان اصلاحات کی ضرورت آج بھی قائم ہے۔ یہی نہیں مقابلے کے امتحان کے بجائے ترقی معکوس براہ راست نامزدگیوں کی صورت میں اس محکمہ میں یعنے انڈین میڈیکل سروس میں آج کی جارہی ہے جس کی وجہ اس کے علاوہ اور کیا بتائی جا سکتی ہے کہ ہندوستان میں قومی سلطنت نہیں ہے۔ مسٹر تلک کی سیاسی زندگی توضیح طلب ہے۔ میں آپ کا ذکر آگے کروں گا۔ میری رائے میں ان کا شمار آیندہ کے لوگوں کے ساتھ ہی مناسب ہے۔

سریندر ناتھ بنرجی بنگال کے سر برآوردہ محبان وطن کے زمرے میں جو اس زمانے میں خدمت خلق کے اہم فرائض انجام دے رہے تھے اور نیز بعد کے آنے والوں میں ہر حیثیت سے سریندر ناتھ بنرجی کی شخصیت نمایاں ترین تھی۔ آپ ان چند انگلیوں پر گِنے جانے والے ہندوستانیوں میں سے تھے جو انڈین سول سروس میں سنہ ۱۸۶۲ء کے قریب کے زمانے میں لئے جا سکے مگر بدقسمتی سے ۳ برس کے بعد محض ایک برائے نام غلطی کی بنا پر برخاست کر دیئے گئے اس برخاستگی کا اثر یہ ضرور ہوا کہ گورنمنٹ کا نقصان ہندوستان کے فائدے کی صورت میں مبدل ہوگیا۔ آپ نے تعلیمات وصحافت کو اپنا جولانگاہ طبع قرار دے کر خدمت خلق کی زندگی اختیار کی۔ آپ کی پہلی دوستی ایشور چندر ودیا ساگر سے ہوئی جنھوں نے مسٹر بنرجی کو

مٹرو پولیٹن انسٹی ٹیوشن میں پروفیسری کی ایک جگہ دی۔ آج یہ کالج ودیاساگر کالج کے نام سے مشہور ہے۔ آپ نے رپن کالج قائم کیا اور یہاں کئی برس تک انگریزی کے پروفیسر رہے۔ آپ کی صحافتی دلچسپی کے متعلق پہلے کہا جا چکا ہے چنانچہ آپ "بنگالی" کو مسٹر ڈبلو۔ سی بنرجی سے لے کر ۱۷ سال تک ہفتہ وار اخبار کی صورت میں نکالتے رہے اس کے بعد اسے روزنامہ بنایا۔

مسٹر انند موہن بوس کی معیت میں آپ نے انڈین ایسوسی ایشن کی بنار ۱
ڈالی۔ اس انجمن کے بارے میں میں ذکر کر چکا ہوں کہ آج بھی یہ نہایت اچھی حالت میں ایک لبرل و آزاد خیال انجمن ہے آپ کانگریس کے دوسرے ہی اجلاس میں جو کلکتہ میں ۱۸۸۶ء میں ہوا آ کر شریک ہوئے اور تھوڑی ہی مدت بعد اس کے ایک مانے ہوئے رہنما سمجھے جانے لگے۔ اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ جو کوئی بھی کانگریس کا صدر ہو مسٹر بنرجی ہر سال اس کے اجلاس میں ایک نمایاں حیثیت رکھتے تھے آپ بہت بڑے مقرر تھے۔ آپ کا نمبر مقرروں میں لال موہن کے بعد تھا جن کے بارے میں سر فیروز شاہ مہتا کا مشہور قول ہے "عدیم المثال و بے عدیل قوت لسانی کا مالک" مگر سریندر ناتھ بنرجی کی تقریر عام مجمع کے لئے مسٹر لال موہن کی تقریر سے زیادہ مناسب و موزوں ہوتی۔ اپنی کتاب "نیو انڈیا" میں سر ہنری کاٹن فرماتے ہیں کہ ملتان سے چٹاگانگ تک مسٹر بنرجی جہاں چاہتے اپنی تقریر سے بغاوت پھیلانے یا اس کے فرو کرنے میں کامیاب ہو سکتے تھے۔ آپ نے دو بار کانگریس کی صدارت فرمائی اور ان موقعوں پر اپنی خداداد قوت حافظہ کا وہ معجزہ دکھایا جس سے عقل دنگ ہے یعنی دونوں بار اپنے طویل چھپے ہوئے خطبات کا ایک ایک لفظ بغیر دیکھے ہوئے دُہرا دیا۔ مادرِ وطن کی خدمت کے سلسلہ میں آپ چار بار انگلستان تشریف لے گئے اور ہر بار آپ کی تقریروں نے وہاں کے بہترین مقررین سے خراجِ تحسین حاصل کیا۔

میں نے بچشم خود دیکھا ہے کہ آپ نے اپنی قوت تقریر سے مانٹیگو انڈیا بل کے مخالف ترین حضرات کو چشم زدن میں متاثر بنادیا۔ آپ برسہا برس تک بنگال کی مجلس قانون ساز کے ایک مشہور و معروف ممبر تھے اس کے بعد وائسرائے کی کونسل کے ممبر ہوئے۔ آپ نے اپنی وفات سے تھوڑے دنوں قبل اپنی سوانح عمری موسومہ بہ اے نیشن ان میکنگ (ایک قوم کی ارتقا) تصنیف فرمائی جس میں اپنی پنجاہ سالہ خدمات خلق کا ایک بصیرت افروز خاکہ کھینچا ہے۔ اس کے مطالعہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ موجودہ بنگال کے سیاسی ارتقا میں آپ کا وہ حصہ ہے جو کبھی اور کسی زمانے میں فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ منٹیگو اسکیم کے تحت میں جو وزرا ہوئے ان میں سے ایک آپ بھی ہوئے۔ اور وزارت کی کرسی قبول کرکے آپ نے کلکتہ میونسپلٹی کے ان حقوق کو جو ۱۸۹۹ء میں اس سے لے لئے گئے تھے دوبارہ دلاکر یہ ثابت کردیا کہ آپکا وزارت قبول کرنا غیر مناسب نہیں تھا۔ مسٹر بنرجی کا وہ نام نامی ہے جو کسی صورت سے ہندوستان کی سیاسی و قومی ترقیوں کے لحاظ سے فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

بنگال کے دیگر رہنما

اس زمانے کے دیگر بنگالی سیاست دانوں میں مسٹر ڈبلو۔ سی بنرجی کا پہلا نمبر ہے جنھوں نے دو بار کانگریس کی صدارت فرمائی ہے۔ آپ کلکتہ بار (وکلا کی محفل) کے ایک مستند لیڈر تھے اور آپ کی رائے نہایت صائب ہوا کرتی تھی اس کے بعد مسٹر من موہن گھوش ہیں اور آپ کے وہ کام جو شعبہ دیوانی و شعبۂ فوجداری کو علیحدہ کرنے کے بارے میں ہوئے ہیں کبھی بھولے نہیں جاسکتے۔ مسٹر رامیش چندر دت کی خدمت خلق کی زندگی ۱۸۹۷ء سے یعنی انڈین سول سروس سے پنشن لینے کے بعد سے شروع ہوتی ہے۔ جب ۱۸۹۹ء میں کانگریس لکھنؤ میں ہوئی تو آپ اس کے صدر تھے۔ آپ کی

تصانیف میں سے انڈیا انڈر آرمی برٹش رول۔(ہندوستان ابتدائی انگریزی عہد میں) انڈیا این دی وکٹورین ایج (ہندوستان عہد وکٹوریہ میں) فیمن اینڈ لینڈ اسسمنٹ این انڈیا (قحط و تشخیص مالگذاری ہندوستان میں) خاص طور پر قابل ذکر ہیں جن کا مطالعہ ہندوستانی سیاسیات سے ذوق رکھنے والوں کے لئے نہایت مفید و سودمند ہے۔

انند موہن بوس

نہایت سرگرمی سے سیاسی کام کرنے والوں کی فہرست میں سر سریندر ناتھ بنرجی کے بعد مسٹر انند موہن بوس کا نام آتا ہے۔ آپ نہایت شاندار مقرر تھے۔ آپ نے سٹی کالج قائم کیا اور سدھارنا سماج کے قائم کرنے والوں میں سے بھی تھے آپ منشیات کے خلاف بہت بڑے مجاہد و معاشرتی اصلاحوں کے زبردست مبلغ تھے۔ لارڈ رپن کے دل میں تو ان کی وہ وقعت تھی کہ انھوں نے آپ کو جب آپ صرف ۳۵ سال کے تھے انڈین ایجوکیشن کمیشن کی صدارت کے لئے مدعو کیا مگر آپ نے زمانے کی حالت کا خیال رکھتے ہوئے یہ کہہ کر صدارت سے انکار کر دیا کہ ہندوستانی کی صدارت میں جو سفارشات ہوں گی انکی وقعت کم ہوگی صدارت کسی کارکردہ انگریز حاکم کے سپرد کی جاوے' آپنے اس کمیشن کی صرف ممبری قبول کی۔ جہاں تک ذہانت و قابلیت کا تعلق ہے مسٹر انند موہن بوس اپنے ہمعصروں میں سے ہر ایک کے ہم پلہ تھے اور آپ کسی ایک شعبۂ زندگی میں اگر ہمہ تن مصروف ہو کر کوشاں رہتے تو انتہائی ترقی کر سکتے تھے مگر اپنے عزیز قریب سر جے۔ سی بوس کے قول کے مطابق آپ نے اپنی ذہانت کے "ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے تھے تاکہ مادرِ وطن کی خدمت مختلف طریقوں اور حیثیتوں سے انجام دے سکیں"۔ آپ کی زندگی کا آخری حصہ مسلسل بیماری میں گذرا۔ آپ کی آخری حالت نہایت دردناک تھی۔ نقل و حرکت سے معذور اور ساتھ ہی ساتھ

گھر پر آپ کا ٹھہرنا محال تھا اس لئے آپ کو کرسی پر بٹھا کر لوگ جلسہ میں اُن دنوں بھی اُٹھا لائے جس دن تقسیم بنگال کا نفاذ ہوا تھا اور وہاں پہونچکر آپ نے نہایت دلدوز و دلگداز تقریر کی۔ اسی سلسلہ میں بابو کالی چرن بنرجی کا ذکر بھی ضروری ہے جو بلند پایہ لیڈر تھے۔ مذہباً آپ عیسائی تھے مگر آپ کا ہر بن مو حب وطنی میں سرشار تھا۔ آپ بھی بلا کے مقرر تھے اور کانگریس کے فدائی تھے۔ یہ بھی ایک اتفاق ہے کہ آپ کانگریس کے صدر نہ ہو سکے۔ آپ کے محاسن و محامد کی جو جامع و مانع توضیح سر راس بہاری گھوش نے کی ہے اس سے بہتر کسی دوسرے الفاظ میں نہیں ہو سکتی۔ سر راس بہاری گھوش کے الفاظ یہ ہیں۔

"ہم کس دل سے اس قابلیت کو اس تواضع و فروتنی و سادگی کو اس زہد و تقویٰ کو اس رقیق القلبی و حب وطنی کو جو قدرت نے آپ کو عطا کی تھیں بھلا سکتے ہیں جو کالی چرن بنرجی کی قبر میں آپ کے ساتھ دفن ہو گئی ہیں۔"

جی۔ سُبرامنیا ایر

مدراس میں خاص قومی کارکن مسٹر جی سبرامنیا آئر تھے۔ آپ نے "ہندو" و نیز کانگریس و مہاجن سبھا کے ذریعہ سے مدراس کے لئے وہی کیا جو سر سریندر ناتھ بنرجی و موتی لال گھوش نے بنگال کے لئے و واچا۔ تلک و گوکھلے نے بمبئی کے لئے کیا ہے۔ اپنے زمانے کے آپ سب سے بڑے ہندوستانی صحافت نگار تھے آپ کی تحریر کے سب سے بڑے مداح مسٹر ہیوم تھے۔ مسٹر ہیوم نے مسٹر سبرامنیا ایر کو ایک بار لکھا کہ اُن کے مضامین ٹائمس آف لندن کے لئے باعث فخر ہو سکتے ہیں۔ مسٹر ہیوم "ہندو" کی پچاس کاپیاں خرید کرتے تھے تاکہ اس کے ذریعہ سے پارلیامنٹ کے ان ممبروں کو جنھیں ہندوستانی مسائل سے دلچسپی ہے یہاں کے حالات کا صحیح اندازہ ہو سکے دیا کرتے۔ فیروز شاہ مہتا و ڈنشا واچا بھی مسٹر ایر کے مضامین کے معترف تھے مگر

مسٹر گوکھلے کا تو یہ عالم تھا جیسے آپ نے مجھ سے خود ارشاد فرمایا ہے کہ مسائل عامہ و سیاسیات پر جو عبور مسٹر سبرامینا ایر کو حاصل ہے تمام ہندوستان میں کسی دوسرے اڈیٹر کو حاصل ہی نہیں ہے'' اخراجات ہند پر جو شاہی کمیشن بیٹھا تھا آپ اس کے سامنے چند ہندوستانی گواہوں میں سے بھی تھے آپ ایک علی، معاشرتی مصلح بھی تھے۔ اگرچہ آپ کانگریس کے صدر نہیں ہوسکے پھر بھی آپ ہر نوعیت سے اس کے لئے مستحق و موزوں تھے۔ آپ کی تصنیف میں ایک کتاب'' سم اکنامک اسپکٹ آف برٹش رول ان انڈیا''
(ہندوستان میں سلطنت برطانیہ کے چند اقتصادی پہلو) ہے جو نہایت کار آمد کتاب ہے۔

مدراس کے دیگر رہنما جو قابل ذکر ہیں ان میں سر ایس سبرامینا ایر جو خوش فہمی و سخاوت کے لئے مشہور تھے۔ مسٹر آنند چارلو جو نہایت خود مختار تھے۔ سر سنکارن جنھوں نے کانگریس کے نہایت پُر آشوب و مصائب کے زمانے میں بہترین خطبۂ صدارت پڑھا۔ مسٹر سی۔ وجیا راگھوا چاریہ جو اپنی دلیری کے لئے مشہور تھے۔ مسٹر ان بھلا او پنٹالو جو قابلیت، موقع شناسی اور ذی فہم تھے و نیز مسٹر ویرا راگھوا چاریہ ''ہندو'' کے۔ دیوان بہادر۔ پی۔ کیسو اپلے گوٹی والے۔ مسٹر پی۔ رنگھیا نیڈو جو عرصہ تک مہاجن سبھا کے صدر رہے اور ۱۸۹۴ء عیسوی کی کانگریس کی مجلس استقبالیہ کے صدر رہے علاوہ بریں مسٹر ایس۔ اے سوامی ناتھ ایر تنجور والے و مسٹر دن کٹرا تھنم وغیرہ کو اپنڈاکے کہے جا سکتے ہیں۔

وی۔ کرشنا سوامی ایر

اس دور کے آخری حصہ میں میرے سب سے زیادہ مہربان دوست تھے۔ سب سے زیادہ ذہین و طباع ہستی صوبہ مدراس میں اور ملک میں ایک بڑی و عظیم الشان شخصیت جو دیکھنے میں آئی وہ مسٹر وی۔ کرشنا سوامی ایر کی تھی۔ آپ لارڈ ایسکوتھ و اکسفورڈ کی طرح معاملہ فہمی میں نہایت تیز طبع و مشاق و لارڈ ہالڈین کے مانند روشن دماغ

تھے - آپ کی تقریر پُرجوش و شُستہ ہوتی - آپ اپنی پُردلی ہمت مردانہ و صابت رائے کے لئے شہرۂ آفاق تھے - اگر فیروز شاہ مہتا کو شیر بمبئی پنڈت اجودھیا ناتھ کو شیر ممالک متحدہ و لالہ لاجپت رائے کو شیر پنجاب کہا جا سکتا ہے تو بیشک مسٹر کرشنا سوامی ایر شیر مدراس کہے جانے کے مستحق ہیں - مسٹر گوکھلے کو آپ کے ساتھ ایک بار ایک سب کمیٹی میں کام کرنا پڑا چنانچہ اس موقع پر مسٹر گوکھلے کے یہ الفاظ تھے "کرشنا سوامی ایر کا ذہن بمقابلہ میرے ذہن کے دونی سرعت سے کام کرتا ہے آپ کی رفتار دماغ کا مقابلہ میرے لئے دشوار ہے" آپ کی وفات پر مسٹر گووند رگھوا ایر نے فرمایا "آپ کی جگہ پر کرنے کے لئے مدتیں درکار ہیں کم از کم ہمارے صوبہ میں آپ کی جگہ مدتوں تک خالی رہے گی" آج آپ کو انتقال کئے کوئی ۲۴ برس ہو چکے ہیں اور میرا خیال ہے کہ یہ جگہ اب تک خالی پڑی ہوئی ہے -

پنڈت اجودھیا ناتھ

یہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ صوبہ متحدہ میں پنڈت اجودھیا ناتھ نے قبل از وقت انتقال فرمایا - آپ کی سیاسی زندگی مختصر تھی مگر ہر حیثیت سے نہایت درخشاں و نمودار تھی - آپ کی ہمت مردانہ کا کوئی دوسرا مدِ مقابل نظر نہیں پڑتا آپ کی شخصیت نہایت زبردست تھی - قدرت نے اپنے ہاتھوں سے آپ کو سنوار کر لیڈر پیدا کیا تھا - یہ ہماری خوش نصیبی ہے کہ آپ نے اپنے بیٹے اور میرے حبیب محترم و رفیق کار مسٹر ہردے ناتھ کنزرو کو چھوڑا ہے جن کے بارے میں خود مسٹر گوکھلے کی پیشین گوئی تھی - "آج لوگ ہردے ناتھ کو اجودھیا ناتھ کے بیٹے کی حیثیت سے جانتے ہیں مگر ایک وقت آوے گا جب اجودھیا ناتھ ہردے ناتھ کے باپ کی حیثیت سے جانے جائیں گے" جن لوگوں کو مسٹر ہردے ناتھ کی نمایاں سیاسی زندگی سے واقفیت حاصل ہے انھیں اس قول پر کسی شک و شبہ کی گنجائش ہی نہیں باقی رہتی - پنڈت اجودھیا ناتھ کے بعد پنڈت بشمبھر ناتھ ہیں جو اپنے

لائق و فائق جو نیر سے پہلے کانگریس میں شریک ہوئے اور ۶۰ برس کی عمر تک اپنے سیاسی مسلک پر قائم رہے۔ اس کے بعد پنڈت بشن نرائن در و بابو گنگا پرشاد ورما (لکھنؤ کے) ہیں۔ پنڈت بشن نرائن در بہت بڑے عالم و فاضل تھے مگر اس کے ساتھ ہی بہت زیادہ منکسر مزاج تھے۔ آپ کی تحریری قابلیت کا اندازہ یوں کیا جا سکتا ہے کہ آپ کی تحریریں آج بھی پڑھی جاتی ہیں۔ اس میں کسی مبالغہ کا دخل نہیں کہ اگر آپ اس قدر منکسر مزاج و فروتن نہ ہوتے اور آپ کی تندرستی بہتر ہوتی تو آپ کہیں زیادہ مشہور ہوئے ہوتے۔ مسٹر گنگا پرشاد ورما اپنی ذاتی قابل تقلید جدوجہد اور اپنی اخلاقی خوبیوں سے بلند مرتبہ رکھتے تھے اور سیاسی زندگی میں آپ ایک بلند و بالا شخصیت کے مالک تھے۔ جو آپ سے واقف تھا وہ آپ کی عزت دل سے کرنے پر مجبور تھا۔ آپ کی موت ۵۱ برس کی عمر میں واقع ہوئی جس نے آپ کے شہر و صوبہ کو وہ نقصان و صدمہ پہونچایا جس کا احساس آج بھی ہو رہا ہے یہ کہنا بالکل درست ہے کہ اپنے بعد آپ نے اپنا کوئی جانشین لکھنؤ میں نہیں چھوڑا۔

پنڈت مدن موہن مالوی اُس زمانے میں اور اب بھی پنڈت مدن موہن مالوی صوبہ متحدہ کے ایک خاص لیڈر مانے جاتے ہیں۔ آپ ہی کی وہ جامع شخصیت ہے جس کی وجہ سے شروع سے آج تک آپ مسلمہ لیڈر مانے جاتے ہیں۔ چند الفاظ میں نہ تو آپ کے ذاتی حالات ہی بیان کئے جا سکتے ہیں اور نہ آپ کی خدمات ہی کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ آپ کی ہستی ایک غیر معمولی ہستی ہے۔ آپ مسٹر ہیوم کے چہیتے تھے۔ یہ آپ ہی کی ذات تھی جس نے بابو گنگا پرشاد ورما کی معیت میں اس زمانے میں بھی کانگریس کا بول بالا کر رکھا تھا۔ آپ غایت درجہ مذہبی شخص ہیں اور آپ کی زندگی نہایت تقدس۔ سادگی۔ بھلائی اور ایثار کی رہی ہے باوجودیکہ آپ کی تندرستی بہت زیادہ اچھی نہیں ہے پھر بھی آپ نے آرام کا کبھی خیال تک

نہیں کیا اور جو کام آپ نے کئے ہیں سب فلاح عامہ کے لئے ہمیشہ کئے ہیں۔ اب اس وقت آپ ٧٤ برس کے ہو رہے ہیں اور آپ کی صحت ناقص ہے جب بھی آپ اسی طرح سرگرم و منہمک ہیں جیسے کہ اس وقت تھے جب کہ آپ نے سیاسی کام شروع کیا تھا جسے آج سے ٥٢ برس کا زمانہ گذر چکا ہے آپ دو بار کانگریس کے صدر ہو چکے ہیں اور اب بھی کانگریس ہی میں ہیں مگر یہ بات وثوق کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی کہ آیا کانگریس بھی آپ کو اپنا کہنے کو تیار ہے۔ آپ کی گوناگوں جلی خدمات میں سے سب سے بہتر نمونہ ہندو یونیورسٹی ہے جو خود آپ کی عظمت کی ایک غیر فانی و روشن یادگار ہے۔

انگریز مخلصین

اُس زمانے کے ان خاص انگریز محبان ہند کے بارے میں اگر لکھنا مقصود ہو تو مسٹر ہیوم و سر ولیم ودڑبرن کے بعد مسٹر ڈبلو۔ یس۔ کین و ولیم ڈگبی کا نام لینا چاہئے۔ مسٹر کین نے ہندوستان کی خدمت مختلف ذرائع سے کی ہے۔ مثلاً کانگریس کی برطانوی کمیٹی۔ انڈین پارلیامنٹری کمیٹی۔ و نیز اینگلو انڈین ٹمپرنس ایسوسی ایشن کے ذریعہ سے جسے آپ نے خود قائم کیا تھا۔ اس ایسوسی ایشن کے ایک سچے دوست مسٹر سیموئل اسمتھ بھی تھے جو اس کے صدر تھے۔ مسٹر سیموئل اسمتھ ہندوستان آل انڈیا ٹمپرنس کانفرنس کی صدارت کے لئے سنہ ۱۹۰۶ء میں تشریف لائے تھے مگر اجلاس ہونے کے ایک شب پہلے ان کا انتقال ہو گیا۔ مسٹر ڈگبی تو ان معدودے چند انگریز صحافت نگاروں میں سے تھے جنھوں نے اپنا حقیقی مقصد زندگی خدمتِ ہند بنا رکھا تھا اور ہندیوں کے حقیقی بہی خواہ تھے۔ آپ نے ہندی فلاح و بہبود کے لئے انگلستان میں عرصہ تک اہم کارہائے نمایاں انجام دئے ہیں اور آپ کی سب سے اہم خدمت آپ کی تصنیف "پراسپرس برٹش انڈیا" (خوشحال برطانوی ہند) ہے جو مسٹر دادا بھائی نوروجی کی "پاورٹی اینڈ ان برٹش رول" (غربت غیر برطانوی حکومت

کی ایک معاون کتاب کہی جا سکتی ہے جس کے مطالعہ سے غیر ملکی سلطنت سے اس حیرت انگیز افلاس کا پتہ جو مادرِ وطن کو گھیرے ہے چلتا ہے۔

مطابع (صحافت نگاری)

صحافت نے اس دور میں بہت ترقیاں کیں۔ "ہندو" "امرت بازار پترکا" اور بنگالی روزنامہ ہو کر نکلنے لگے۔ اس کے علاوہ بہت سے اخبارات و جرائد دیسی زبانوں میں بکثرت نکلے اور مفید کام کرتے رہے۔ اسی دور میں مسٹر جی پرامیسواران پلے نے "مدراس اسٹینڈرڈ" کو اپنے قبضے میں لے لیا اور چند سال جو آپ زندہ رہے اس میں آپ اس اخبار کی اڈیٹری بہت قابلیت و واقفکاری سے کرتے رہے۔ ۱۹۰۳ء میں مسٹر جی سبرامنیا ایر نے ایک ہفتہ وار جریدہ "یونائیٹڈ انڈیا" نام کا جاری کیا۔ یہ اخبار بہت عمدہ تھا۔ آپ نے ہندو کو چھوڑ کر "سدیشی ستارن" تامل زبان میں بھی نکالا۔ مسٹر این۔ ین گھوش کا "انڈین نیشن" و مسٹر مالاباری کا "انڈین اسپکٹیٹر" کلکتہ و بمبئی سے نکالے گئے اور سارے ملک میں عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے آپ کی رائے کی بہت وقعت تھی "دی انڈین یونین" الہ آباد سے جاری ہوا جس کی اڈیٹری پہلے پنڈت مدن موہن مالوی اور اس کے بعد میرے دوست بابو پریا نند سنہا کرتے رہے۔ اس دور کا خاص اخبار لکھنؤ کا "ایڈوکیٹ" تھا جسے بابو گنگا پرشاد ورما نے قائم کیا تھا اور اسی اخبار میں پنڈت بشن نرائن در نے اپنے چند معرکۃ الآرا مضامین لکھے تھے۔ اس اخبار کا ہاتھ مسٹر سچدانند سنہا کے اخبار "انڈین پیپل" نے الہ آباد سے تین برس بعد نکل کر بٹایا۔ یہ اخبار اب "لیڈر" میں ملا دیا گیا ہے۔ صوبہ پنجاب میں "ٹریبیون" مسٹر این گپتا کی ادارت میں نکلا جس نے سارے ملک میں ہمہ گیر شہرت حاصل کی۔ سر ڈینس فز پٹرک جس وقت پنجاب کے گورنر تھے اسوقت یہ اخبار بہت زیادہ قوت و حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ اس کی قوت کی یہ حالت تھی کہ لاہور کے اینگلو انڈین اخبار "سول اینڈ ملٹری گزٹ" نے ایک بار یہ دریافت کیا کہ آیا صوبہ کا انتظام ٹریبیون کے رائے سے ہوتا ہے یا سر ڈینس کی رائے سے۔

فصل سوّم

سنہ ۱۹۰۵ء تا سنہ ۱۹۱۹ء

تقسیم بنگال اور اس کے بعد

جس سیاسی ارتقاء و بیداری کا احساس کوئی پندرہ برس بعد پورے طور سے ہوا اس کے بیج چند دنوں پہلے بوئے جا چکے تھے۔ سنہ ۱۹۰۳ء میں پہلے پہل عجلت پسندوں کی آواز کان میں آئی۔ بابو بپن چندر پال جنھوں نے سنہ ۱۸۸۷ء کی مدراس کانگریس میں آکر شرکت کی تھی سنہ ۱۹۰۳ء میں اپنے ہفتہ وار اخبار نیو انڈیا میں مروجہ احتجاجی طریقے سے اختلاف ظاہر کرنا شروع کیا اور نٹور کے مہاراجہ جو کلکتہ کانگریس کی مجلس استقبالیہ کے صدر ہوئے پہلے شخص تھے جنھوں نے اپنی جدّ وجہد کو سیاسی بھیک منگائی کے نام سے یاد کیا۔ مسٹر اے۔ چودھری (جو بعد میں سر اے جسٹس چودھری ہوئے) نے بھی یہی طرز اختیار کیا۔ اپنے معمہ بازی کے الفاظ میں خصوصاً اپنے صوبہ بنگال کی کانگریس کے صدارتی خطبہ میں سنہ ۱۹۰۴ء میں کہا کہ رعایا قوم و غلام قوم کی کوئی سیاست ہی نہیں" سچ تو یہ ہے کہ لارڈ کرزن کی ناعاقبت اندیش پالیسی ایسے خیالات کے

اظہار کی باعث ہوئی خاصکر بنگال میں یہ آثار بیشتر نمایاں ہوئے - اسی زمانے میں تقسیم بنگال کی خبر ہوا میں گونج رہی تھی - اور ۱۹۰۵ء میں جب بنگال کی تقسیم ان طریقوں سے بھی کہیں زیادہ ستیاناس کرکے کردی گئی جو پہلے معلوم ہوچکے تھے تو پھر کیا کہنا تھا تمام بنگال میں اک آگ سی لگ گئی - اس پر سونے پر سہاگا تو یہ ہوا کہ اس تقسیم پر قناعت نہیں کی گئی بلکہ صوبۂ بنگال کے لفٹنٹ گورنر سر بفلڈ فلر نے صاف صاف اپنی نئی پالیسی کا اظہار کردیا جس کا مقصد مسلمانوں کو ترجیح دینا تھا انھوں نے ہندوؤں کو نقصان پہونچانا اور ان پر سختیاں برتنا اختیار کرلیا - بنگالیوں نے برٹش مال کا بائیکاٹ اختیار کیا اور یہی مؤثر ترین آلہ اُن کو انگلینڈ کی نظر اپنی طرف ملتفت کرنے کا سمجھ میں آیا - اس بائیکاٹ کی پالیسی نے کانگریس میں رخنہ ڈالا جو زور پکڑتا گیا - اس تجویز کی پہلی آواز بازگشت بنارس کانگریس میں پہلی بار سُنائی پڑی اور تعجیل پسندوں نے اس کے مظاہرے کی پہلی تجویز سبجکٹ کمیٹی میں ہمارے بادشاہ جو اس وقت ولیعہد بہادر تھے اور ان کی اہلیہ معظمہ کے خیر مقدم کی مخالفت میں پیش کی یہ لوگ اس وقت ہندوستان تشریف لائے تھے - (ہمارے بادشاہ سلامت جارج پنجم کا انتقال جنوری ۱۹۳۶ء میں ہوگیا) - لارڈ منٹو کے خطوط ابھی حال میں ایک کتاب کی صورت میں شایع ہوئے ہیں - اس کے ایک ٹکڑے سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسٹر گوکھلے شاہی آمد کے سخت مخالف تھے - کیا اسی طرح تاریخیں لکھی جاتی ہیں؟ حقیقت تو یہ ہے کہ مسٹر گوکھلے کو شاہی وردد کی مخالفت کی تجویز سے دور کا بھی لگاؤ نہ تھا - سبجکٹ کمیٹی میں جن لوگوں نے بائیکاٹ کی تجویز میں نمایاں حصہ لیا تھا ان میں سے مسٹر تلک اور لالہ لاجپت رائے تھے اور جن لوگوں نے اس کی مخالفت کی اور اس تجویز کو مسترد کرایا ان میں خاص طور پر مسٹر گوکھلے - آر، سی، دت اور سریندر ناتھ بنرجی تھے -

یہی بائیکاٹ کا مسئلہ اصل جھگڑے کی جڑ تھا۔ آخر میں ایک نہایت معقول مصالحت عمل میں آئی جس سے دونوں پارٹیوں میں اتحاد پھر سے قائم ہوگیا اور جانبین کے لیڈروں نے اس کی تائید کی ۔ پھر کیا تھا۔ احتجاج وسختی دونوں کا بازار گرم ہوگیا۔ صوبۂ بنگال کی کانفرنس کا اجلاس جو مسٹر اے۔ رسول (جو مسلمان تھے) کی صدارت میں منعقد نہیں ہوسکا اس لئے کہ لفٹنٹ گورنر یعنے سر بمفلڈ فلر کے حکم سے پولیس نے ڈنڈے مار مار کر مجمع کو منتشر کردیا۔ لارڈ مارلے نے جو اس وقت وزیر ہند تھے اسے ناپسند کیا۔ چنانچہ لفٹنٹ گورنر صاحب کو چند ہفتوں کے بعد ہی استعفادے دینا پڑا۔ آپس کی اختلاف رائے نے زور پکڑا اور ۱۹۰۶ء کے موسمِ خزاں تک تو یہ نوبت پہونچی کہ کامیاب کانگریس کے اجلاس کے لئے صرف ایک صورت نظر پڑتی تھی وہ یہ تھی کہ مسٹر دادا بھائی نوروجی جو اس وقت ولایت میں تشریف رکھتے تھے اور جن کی عمر اُس وقت ۸۱ برس کی تھی وہی اس اجلاس کی صدارت کریں۔

یہ اجلاس اس بزرگ ہستی کی صدارت میں کلکتہ میں نہایت شاندار ہوا البتہ کمیٹی میں بہت زیادہ شور وشغب ہوا کیا جسے میں نے بچشم خود دیکھا ہے۔ پُرانے لیڈروں کے ساتھ جس گرے ہوئے طریقے سے برتاؤ ہوا بیشک نہایت تکلیف دہ تھا۔ غیر رواداری کا شرمناک مظاہرہ ہوا یہاں تک کہ بڑے، اور پُرانے لیڈروں کی کوئی سنتا ہی نہیں تھا اور انھیں اپنی تقریر کا بدقت تمام موقع ملتا تھا۔ بسا اوقات وہ اپنی کوشش میں ناکامیاب ہوکر تھک کر بیٹھ بھی جاتے تھے ۔ آخرکار مسٹر دادا بھائی کی صدارت کی وجہ سے صلح ہوئی۔ اس صلح نے سچ تو یہ ہے کہ کانگریس کو تباہ وبرباد ہونے سے بچالیا پھر بھی اس کے طرح طرح کے معنی لگائے جانے لگے اور پُرانے لیڈروں کے خلاف ایک نامنظم جماعت پیدا ہوگئی جس کے روحِ رواں دوسرے سال مسٹر تلک قرار دئے گئے۔

۱۹۰۷ء

۱۹۰۷ء ملک کے لئے ایک منحوس سال ثابت ہوا جس میں آلام و مصائب کے گھنے بادل تمام ملک پر چھاگئے خصوصاً پنجاب پر۔ وہاں کے لفٹنٹ گورنر سر ڈنزل ابٹسن کے طرز و طریقے تکلیف دہ تھے جن سے رعایا میں بے چینی پیدا ہوئی۔ اوروں کو تو جانے دیجئے۔ نو آبادیات کا بل تو ایک اندھیر تھا جس پر بہت زیادہ چیخ پکار ہوئی جس کی رعایا نے سخت مخالفت کی۔ اس مخالفت کو فرو کرنے کے لئے گورنمنٹ نے لالہ لاجپت رائے کو جلاوطن کر دیا۔ اور بنگال ریگولیشن نمبر ۳ ۱۸۱۸ء کو جاری کر کے اور نیز ایک وقتی قانون "بغاوت کے جلسوں کے انسداد کا وقتی قانون" کے ذریعے سے راولپنڈی کے معززین و شرفا کے خلاف مقدمے چلائے۔ یہ وقتی قانون ایک مستقل قانون بنا ڈالا گیا۔ نو آبادیات کے بل کو لارڈ مارلے نے مسترد و منسوخ قرار دے کر پنجاب میں امن و سکون کی لہر دوڑائی مگر بنگال میں تقسیم بنگال کی مخالفت نہایت زور و شور سے باقی رہی۔ صحیفہ نگاروں و مطابع کے آدمیوں کے خلاف کارروائیاں دھڑا دھڑ جاری رہیں۔ جس کا نتیجہ بد سے بدتر ہوتا گیا۔ تعجیل پسند گروہ مسٹر تلک کی قیادت میں بڑھتا گیا۔ شورش روز افزوں ہوتی گئی۔ مشرقی بنگال میں شرمناک فرقہ وارانہ بلوہ بھی ہو گیا اور موجودہ لفٹنٹ گورنر سر بمفلڈ فلر کی پالیسی جو بیشتر مسلمانوں کو ترجیح دئے جانے پر مشتمل تھی غیر اطمینانی کیفیت پیدا کر دی تھی اور نیز یہی پالیسی حکام بھی اس وقت برتتے تھے۔ یہ پالیسی اس حد تک اختیار کی گئی کہ ایک سشن جج نے گواہان کو دو طبقوں میں یعنے ہندو و مسلمانوں میں تقسیم کر کے مسلمانوں کی گواہی کو صرف اس بنا پر کہ وہ مسلمان ہیں ترجیح دی۔ ایک مقام پر چند مسلمانوں نے ڈگی پیٹ دی کہ گورنمنٹ نے ہندوؤں کو لوٹ لینے کی اجازت دے دی۔ ایک دوسری جگہ جیسا کہ ایک مجسٹریٹ کے بیان سے ظاہر ہے یہ کہا گیا کہ گورنمنٹ نے مسلمانوں کو ہندو بیواؤں کے ساتھ نکاح کرنے کی اجازت

دے دی ہے ۔ آپس کے شرمناک مناقشات و بلووں کا یہ اثر ہوا کہ ایک سُرخ رسالہ مشرقی بنگال کے مسلمانوں نے تقسیم کیا جس کا ذکر اس وقت کرنا مناسب نہیں ہے ۔
اس سال کے آخر میں پنجاب میں ضرور سکون ہوا کیونکہ لالہ لاجپت رائے ۶ ماہ کے بعد رہا کر دئے گئے مگر بنگال کی وہی حالت قائم رہی ۔ سارا ملک چین و اطمینان کی زندگی کے لئے ترس رہا تھا ۔ کانگریس ناگپور میں ہونے والی تھی مگر مجلس استقبالیہ کا جلسہ ہی نہ ہو سکا ۔ پھر سورت میں کانگریس کا اجلاس ہونا طے ہوا جس کے لئے تھوڑی سی مدت میں بڑی بڑی تیاریاں ہوئیں مگر پھر بھی اجلاس فسخ ہوا ۔ اجلاس جمع ضرور ہوا مگر مشکل سے صدارت کا خطبہ شروع ہوا تھا کہ شور و شغب کی وجہ سے جلسہ برخاست کرنا پڑا ۔ دو جماعتیں جو اس وقت پیدا ہو گئی تھیں اس میں اختلاف رائے کی وجہ سے مناقشہ کا نمونہ بن کر تمام ملک میں پھیلی ہوئی تھیں ۔

سوراج

کانگریس کی اجڑی ہوئی محفل کے بعد قدیم پارٹی کے لوگ جمع ہوئے اور ۴ مہینہ بعد الہ آباد میں کانگریس کا دستور العمل مرتب ہوا جس کی ابتدائی دفعہ یہ تھی "انڈین نیشنل کانگریس کا مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کے باشندے ایسی سلطنت اپنے لئے حاصل کریں جیسی کہ دوسری قومیں جنھیں خود سلطنت کرنے کا حق حاصل ہے کر رہی ہیں اور ہندوستان کو انھیں قوموں کے مانند سلطنت برطانیہ کے ساتھ اپنے فرائض و ذمہ داریوں میں برابر کا مرتبہ حاصل ہو ۔ اس مقصد کے حصول کے لئے آئینی طریقے اختیار کئے جائیں جن سے متواتر ترقی پذیر اصلاحات نظام سلطنت موجودہ نظام سلطنت میں رونما ہوں جن سے قومی اتحاد پیدا ہو اور ذہنی، دماغی، اقتصادی، حرفتی ترقیاں ملک میں رونما ہوں"۔
سوراج کا لفظ اگر میں غلطی نہیں کرتا مسٹر تلک نے گذشتہ صدی میں ۱۸۹۰ء کے قریب استعمال کیا تھا ۔ مگر سودیشی تحریک کی طرح باوجودیکہ مسٹر تلک خود اس کے

سرگرم محرک تھے اسے وہ مقبولیت اُس وقت نہ حاصل ہوئی جو اس لفظ کو آج حاصل ہے۔ مسٹر گوکھلے پہلے شخص تھے جنھوں نے لندن کی ایک انجمن کے سامنے "ہندوستان میں خود معیار سلطنت" پر ایک مضمون پڑھا۔ ۱۹۰۴ء کی کانگریس کے صدر سر ہنری کاٹن تھے۔ آپ کو لارڈ کرزن نے لفٹنٹ گورنر اس وجہ سے نہ ہونے دیا کہ آپ نے آسام کے قلیوں کی مدد آسام میں سرگرمی کے ساتھ کی تھی۔ آپ نے کانگریس کے نصب العین کی تشریح و توضیح جو قدیم محبان وطن کا مفہوم ہے ان الفاظ میں کی ہے۔

"آزاد و جداگانہ ریاستوں کا ایک فیڈریشن جسے یونائیٹڈ اسٹیٹس آف انڈیا کہا جائے جس کا نو آبادیات سے برابری و برادری کا سا تعلق ہو اور ہر ریاست کو پوری اندرونی خود مختاری حاصل ہو اور سب کا تعلق برطانیہ عظمیٰ کے ساتھ ایک رشتہ میں منسلک ہونے کا ہو۔"

اس کے دوسرے ہی سال بعد مسٹر گوکھلے نے کانگریس کے صدر کی حیثیت سے کانگریس کے نصب العین کی ان الفاظ میں تشریح فرمائی "تدریجاً ہندوستان کو ایسے ہی نظام کا ملنا جیسا کہ خود مختار نو آبادیات کو قلمرو برطانیہ میں اسوقت حاصل ہے"۔ دادا بھائی نوروجی نے ۱۹۰۶ء کی کانگریس میں صدارت کرتے ہوئے صاف صاف فرمایا ہے "کانگریس کا مقصد نو آبادیات یا یونائیٹڈ کنگڈم کی طرح گورنمنٹ یا سوراج (ہندوستان کے لئے) حاصل کرنا ہے۔ آپ کے اس خطبہ کو مسٹر سریندر ناتھ بنرجی نے "ہندوستان کا سیاسی آسمانی صحیفہ" کہا ہے جو کچھ اب تک یا اس سے پہلے تقریروں میں کہا جاتا تھا ضابطہ کے ساتھ مرتب ہو کر کانگریس کے منظور شدہ نصب العین بنا کر ۱۹۰۸ء کے دستور العمل میں شایع کر دیا گیا۔

پرانی اور نئی پارٹی ہمیں مسٹر کرشنا سوامی ایر کے استقلال کا ممنون ہونا چاہئے

جس کے بدولت نئے دستور کے تحت میں پہلی کانگریس مدراس میں منعقد ہوئی اور اُسی نہج وطریقے سے ۱۹۱۵ء تک اس کے جلسے یعنے سر ایس۔پی سنہا کی صدارت میں جو بعد میں لارڈ سنہا ہوئے برابر ہوتے رہے۔ آپ نے نصب العین کانگریس کو مسٹر ابراہم لنکن کے مشہور ومعروف جملہ میں یوں ادا کیا ''ملک کے باشندوں کی وہ سلطنت جو لوگ باشندوں کے لئے اور باشندوں کے ذریعہ سے کریں''

اس دوران میں نئی اور پُرانی پارٹیوں میں اختلاف قائم رہا جس میں کبھی کبھی اس میں زور بھی آجاتا اور کبھی یہ اختلاف دھیرا ہوجایا کرتا مگر اختلاف باقی ضرور رہا۔ نئی پارٹی کانگریس میں شریک ہونے کی پروا نہ کرتی۔ ان کا وہی طریقہ تھا جو اب لبرل کا طرز ہے۔ یعنے کانگریس محض ایک پروپگنڈے کی جماعت ہے جس میں ایک سے زائد پارٹی کی گنجائش ہی نہیں ہے ان لوگوں نے اپنا وہی رویہ جو اس وقت لبرل جماعت کا ہے اختیار کیا یعنے پروپگنڈہ کرنے والی جماعت اور قانون ساز جماعت کے درمیان اتحاد مشکل ہے اس لئے کہ قانون ساز جماعت نے مختلف خیالات اور رائے کے افراد کا ہونا لابدی ہے اور اسے نمائندگی کی حیثیت حاصل ہونی چاہئے تاکہ یہ سب کے لئے قانون بنا سکے اور ٹکیس عائد کرسکے کانگریس محض ایک پروپگنڈہ جماعت کے صرف ایک خاص مقصد کیلئے ایک خاص خیال یا خاص رائے کے لئے ہے اگر اس میں مختلف الخیال یا مختلف الآرا افراد یا انجمنیں شریک ہوجائیں تو اس کی اصل بقا کا مقصد ہی فوت ہوا جاتا ہے بمقابلہ ان ایام کے جب کانگریس ایک متحدہ ومنظم جماعت تھی ادھر اس کے اجلاس پھیکے ہوا کئے مگر رفتہ رفتہ پھر اس میں شرکا کی تعداد بڑھتی گئی۔

بہرحال اسے ماننا پڑے گا کہ عام لوگ آزاد خیال جماعت کے ساتھ تھے۔ اس جماعت میں نوجوان بیشتر شامل تھے جن میں جوش وبلند ہمتی تھی۔ پُرانی پارٹی کے مقابلہ میں عام لوگ (پبلک) ان لوگوں کے خیالات سے زیادہ متاثر ہوتے۔

چند الفاظ میں یہ لوگ یوں کہتے ۔" تم کو شکایتیں ہیں مگر تمھاری کوئی سنتا نہیں ۔ تم ختم ہو جاتے ہو ۔ تم میں سے بہتیرے فاقے کرتے ہیں ۔ پڑھے لکھوں کو اپنی قابلیت دکھانے کا موقع نہیں ملتا ۔ حکام اہل وطن کو ذلیل و خوار سمجھتے ہیں اور اُن کو گرا ہوا خیال کرتے ہیں ۔ اس کی وجہ کیا ہے ؟ وجہ صرف یہ ہے کہ تم پر ایک بدیشی سلطنت حکمران ہے ۔ اس کا علاج کیا ہے ۔ بس ۔ اس بدیشی سلطنت کی جگہ پر اپنے ملک والوں کی سلطنت قائم کرو" معمر آئین پسند قائدین زمانے کا اونچا نیچا دیکھے ہوئے تھے اور اپنی اس جماعت سے عدم شرکت کے وجوہات بتاتے ۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ معمر لیڈر بدیشی سلطنت کے نقائص ہی نہیں بتاتے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اپنے ملک اور اپنے اہل وطن کی کمزوریاں بھی بیان کر دیتے ۔ تمثیلاً مسٹر گوکھلے یوں فرماتے " بدیشی سلطنت بلا شک و شبہ ایک بُرائی ہے ایک عذاب ہے مگر اس کا سبب کیا ہے اگر ہم میں اور ہمارے اہل وطن میں خود بُرائیاں نہ ہوتیں تو بھلا بدیشی سلطنت کیسے قائم ہو سکتی ۔ کیا تاریخ پکار پکار کر ہم سے یہ نہیں کہہ رہی ہے کہ اگر ہماری وطن کی سیاست میں پہلے سے بُرائیاں نہ ہوتیں جس کی وجہ سے بدیشی سلطنت یہاں قائم ہو سکی کیا ہم ان برائیوں کو دُور کر سکتے ہیں ؟ کیا ان بُرائیوں کا دُور کرنا ہمارا پہلا فرض نہیں ہے تاکہ ہم اپنی سلطنت یا سوراج کو حاصل کر کے قائم بھی رکھ سکیں ۔ یہ ایک سیدھا سادہ مسئلہ ہے اور وہ لوگ جو علم النفس عامہ سے واقفیت رکھتے ہیں خوب جانتے ہیں کہ عام لوگ دلائل و براہین و معقولات کے سمجھنے سے بالکل قاصر ہیں اور کھُلی کھُلی بلند پروازیاں بمقابلہ ان باتوں کے جس میں سبب و نتیجہ کا اظہار ہو ۔ واقعات و حالات کی تشریح و توضیح ہو پبلک کو اپنی جانب متوجہ کرنے کے لئے زیادہ بلکہ بہت زیادہ کامیاب ہوا کرتی ہیں ۔ اور جوشیلے الفاظ جن کا اثر ذاتی خیالات فخر و مباہات کے خیالات اور بیخود بنا دینے والے جذبات پر ہوتا ہے ۔ اپنے

پروپگنڈے میں جنچے اور تُلے ہوئے۔ غور و خوض کئے ہوئے اور نیز آزمودہ دلائل کے مقابلہ میں جو اعتدال پسند گروہ کا مسلک ہے اَن پڑھ اور ناواقف کار طبقہ پر بہت زیادہ کارگر ہوتے ہیں یہی نہیں اعتدال پسند طبقہ کے لئے ایک اور آفت درپیش ہوتی ہے کہ ان کی بھلا سننے تک کے روادار نہیں ہوتے اس لئے کہ عجلت پسندوں نے پبلک کو دھوکا دے کر اپنا بنا لیا ہے اور رواداری برتنا اور دوسروں کی بھی سننا ان کا شیوہ ہی نہیں رہا ہے۔ آج کل کے اعتدال پسند لیڈروں کو اظہار رائے کا موقع خود کانگریسی جوشیلے نہیں دیتے۔ حالانکہ پکار پکار کر آزادانہ اظہار رائے کے مدعی بنے بیٹھے ہیں اور کہتے پھرتے ہیں کہ آزادی سے اظہار رائے کے لئے وہ سرگرم کار ہیں۔ افسوس ہے کہ جس چیز کے لئے وہ لڑ رہے ہیں وہی چیز خود یہی لوگ اپنے ہم وطنوں کو نہیں دے رہے ہیں۔ اعتدال پسندوں کی جو زبان بندی کانگریسی جوشیلوں کے ہاتھ آج ہو رہی ہے ایسی تو نہ کسی قانون یا کسی گورنمنٹ نے آج تک کی ہے۔ نوبت یہ آن پہونچی ہے کہ اعتدال پسند طبقہ کے لئے اب دو باتیں ہیں یا تو وہ خدمت ملک کو ترجیح دیں یا محض چیخ و پکار کرنے والے طبقہ کو خوش کریں۔ عجلت پسندوں کے لئے محض ایک کام ہے کہ وہ لمبی چوڑی باتوں سے اپنے اہل ملک کو خوش کر دیں۔ نہیں تو مصائب کا خاتمہ نہیں ہے تعجب خیز امر تو یہ ہے کہ گورنمنٹ خود اس قدر شان استغنا میں سرشار ہے اور معقول پسند باتوں سے اس قدر بے خبر ہے کہ اعتدال پسند آج اپنے اہل ملک کو اپنی اہم کارگذاریوں اور کاموں کو بتا نہیں سکتے۔ ان دونوں جماعتوں کے اختلافات طبعی اختلافات ہیں۔ صرف کسی ایک خاص مسئلہ پر اختلاف نہیں ہے بلکہ نصب العین اور طور و طریقوں میں بھی اختلاف موجود ہے جس کی وجہ سے سیاسی زندگی میں اختلاف لابدی و لازمی ہے۔ یہ تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ پہلے سے کہیں زیادہ

جس قدر تعجیل پسندی کا اظہار کیا جائے اسی قدر عام طبقہ میں اُسے مقبولیت حاصل ہوگی اور گمان غالب ہے کہ اس مقبولیت حاصل کرنے کا بے دام و کوڑی والا طریقہ آگے چل کر طبقۂ عوام میں بہت زیادہ پسند ہو۔

مزید سختیاں تمام ملک میں احتجاج کی اِک آگ لگی ہوئی تھی۔ تقسیم بنگال جو بقول لارڈ مارلے "ایک طے شدہ واقعہ تھا" اور بقول سر راش بہاری گھوش "ایک غیر طے شدہ مسئلہ" تمام نظام سیاسی کو ایک ٹپکتے ہوئے پھوڑے کی طرح بے چین کئے ہوئے تھا۔ کھلی ہوئی سیاسی مخالفت پر سختیاں ہوئیں جس کا اثر ڈھکی ہوئی مخالفت ہو نکلی۔ سر ایڈورڈ بیکر لفٹننٹ گورنر بنگال فخر یہ کہتے رہے کہ کھلی ہوئی بغاوت روک دی جائے تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تشدد پسندیوں کے حرکات جو اس کے بعد ہوتی چلی آ رہی ہیں اسی ناعاقبت اندیش پالیسی کا ثمرہ ہیں۔ اہل قلم و اہل زبان (مقررین) کے خلاف کارروائیاں بے دھڑک جاری ہیں اور دھڑا دھڑ ان کے خلاف مقدمے چلائے جاتے تھے۔ ۱۹۰۸ء کے وسط میں مسٹر تلک پر بغاوت کے الزام میں دوبارہ مقدمہ چلایا گیا جس میں موصوف کو ۶ سال کی سزائے جلاوطنی دی گئی اور اس گروہ کے تقریباً ہر لیڈر کے خلاف کارروائیاں ہوئیں۔ سب سے پہلی بم بازی ۳۰ اپریل ۱۹۰۸ء کو مظفرپور میں ہوئی یہ بم مسٹر کنگ فورڈ جو کلکتہ میں چیف پریسیڈنسی مجسٹریٹ کو مار ڈالنے کی نیت سے مارا گیا تھا اس لئے کہ انھوں نے بہت سے سیاسی قیدیوں کو جیل کی سزائیں دی تھیں مگر غلطی سے اس سے مسز و مس کینڈی ہلاک ہوگئیں۔ مسز کینڈی مسٹر کینڈی کی زوجہ تھیں اور مس کینڈی اُن کی لڑکی تھی۔ مسٹر کینڈی افسوس کا مقام ہے کہ اس بلا کے نشانہ بنے۔ آپ ابتدائی عمر میں ایک سرگرم کانگریسی تھے۔ اِس حرکت کو روکنے کے لئے گورنمنٹ نے دو قوانین نافذ کئے یعنے

اکسپلوسیو بٹس ایکٹ و انسایٹ منٹ ٹو آفینسز ایکٹ کلکتہ میں ایک سازش کی سراغ رسانی ہوئی جس کی شرکت کے الزام میں بہت سے لوگوں پر مقدمے چلائے گئے۔ ان میں سے خاص مجرم مسٹر آر بند و گھوش قرار دیئے گئے یہ صرف دو سال قبل سیاسیات میں شریک ہوئے تھے۔

مسٹر آر بند و گھوش

آپ آئی، سی، ایس میں نہ لئے جانے کے بعد ریاست بڑودہ میں تعلیم کے محکمہ میں ملازم تھے اس کے بعد آپ کلکتہ اپنے وطن آئے اور آپ نے سیاسی زندگی اختیار کی۔ آپ "بندے ماترم" نامی اخبار کے اڈیٹر تھے۔ انگریزی میں آپ کو تعجب انگیز ملکہ حاصل ہے۔ آپ کے مضامین میں تصوف کی جھلک تھی مگر انپر ادبیت کا ایک گہرا رنگ چڑھا ہوتا تھا جس میں آتشی سیاسی تخیل دوڑتا ہوتا آپ کے مضامین بہت پسند کئے جاتے تھے مگر خیال تھا کہ اس سے عام طبقہ شورش کی جانب رجوع ہو رہا ہے۔ اس مردود و شرمناک الزام سے مسٹر آر بند و گھوش بری ہو گئے۔ آپ کے مقدمہ میں آپ کی جانب سے وکیل تھے وہ مسٹر سی، آر، داس تھے جنھوں نے سارے ملک میں پہلے پہل اس معاملہ میں شہرت حاصل کی اور جو بعد میں افق سیاسیات ہند پر ایک درخشاں ستارہ بن کر چمکے اس کے تھوڑے ہی دنوں بعد مسٹر آر بند و گھوش سیاسیات و نیز برطانوی ہند سے علیٰحدہ ہو گئے۔ اب آپ کا خاص مشغلہ فلسفہ اور مذہبی مضامین ہیں جن کو آپ کی درخشاں انشا پردازی نے چار چاند لگا دیئے ہیں۔

جلا وطنیاں

۱۹۰۸ء کے آخری مہینے میں ریگولیشن نمبر ۳ ۱۸۱۸ء کے تحت میں بنگال کے کئی رہنما جلا وطن کر دیئے گئے جن میں بابو اسوینی کمار دت و کرشن کمار مترا بھی تھے۔ یہ وہی قانون ہے جسے سر راش بہاری گھوش نے "قانون خلاف قانون" کے نام سے یاد فرمایا ہے۔ اسی مہینے میں

کرمنل لاامنڈمنٹ ایکٹ بھی پاس کر دیا گیا جس کے دوسرے حصّے کو انجمنوں کو خلاف قانون قرار دینے میں نہایت وسعت سے کام میں آج تک لایا جا رہا ہے۔ مختصر تو یہ ہے کہ گورنمنٹ نے شکایتیں دُور کرنے کے بجائے سختی سے کام لینا اور اس کے ذریعے سے شورش کو دبانا چاہا اور یہی ہر غیر ذمہ دار گورنمنٹ کا مذموم طرز و طریقہ رہا ہے اس بات کو ہم تا زیست نہیں بھول سکتے اس لئے کہ اس وقت سے اس وقت تک کی تاریخ ہمیں یہی بتا رہی ہے۔

اصلاح نظام

کیا سختی ہی گورنمنٹ کی پالیسی بن کر کامیاب ہو سکتی تھی؟ ہرگز نہیں۔ لارڈ مارلے جو اس وقت وزیر ہند تھے اور لارڈ منٹو جو اس وقت وائسرائے تھے دونوں نے اصلاح نظام کی ضرورت کو پورے طور پر محسوس کیا۔

۱۸۹۲ء کا ایکٹ دقیانوسی ہو چلا تھا اس لئے اہل ملک کو کچھ مزید اطمینان دلانے کی غرض سے نئی کاونسلوں کا بنایا جانا مناسب خیال کیا گیا۔ اصلاح نظام کے لئے جو انہماک دکھایا گیا اس کا پہلا پھل ایک تجویز مورخہ ۲۳ راگست ۱۹۰۷ء کی صورت میں سر ہیرلڈ اسٹورٹ کی دستخط کے ساتھ جو گورنمنٹ ہند میں ہوم سکریٹری تھے شائع ہوئی یہ تجویز اصلاح نظام کی تھی۔ اس کی تشریح تنفر آمیز ہے اسے اگر علمی مذاق کہا جائے تو زیادہ مناسب ہے اس کی تجویزیں اسقدر نقصان رساں اس درجہ قابل اعتراض اور اس قدر رجعت انگیز اور رجعت پسند تھیں کہ تمام ملک میں ایک شخص نے بھی اسے پسند نہیں کیا اس اسکیم کا اصلی مقصد یا سنگ بنیاد طبقات اور جمعیتوں کو حقوق نمائندگی دے کر ہند کی آزادی کی بڑھتی ہوئی لہر کو روک دینا تھا اور جو تجویزیں مدراس گورنمنٹ نے پیش کیں ان کا کیا کہنا۔ اس کی تجویز تو علٰحدہ علٰحدہ ہر ذات اور ہر پیشہ کو نمائندگی کی بابت تھی اس کے

جو بہترین نکتہ چینیاں ہوسکتی تھیں انھیں پنڈت بشن نرائن در نے صوبہ متحدہ کی کانفرنس کے موقع پر جو ۱۹۰۸ء میں لکھنؤ میں ہوئی تھی پیش کیں ہمیں لارڈ مارلے کا بیشک شکرگذار ہونا چاہیے کہ آپ نے نہایت تحمل سے کام لیا اور ساتھ ہی ساتھ مسٹر گوکھلے ہمارے انتہائی شکریہ کے مستحق ہیں کہ آپ نے بحیثیت ہند کے نمائندے کے انکے سامنے ایسے معقول و مسکت دلائل پیش کیے جسکی وجہ سے وہ اسکیم مسترد و نامنظور ہوگئی اور اس کی جگہ پر وزیر ہند کا مراسلہ مورخہ ۱۷ دسمبر ۱۹۰۸ء شایع ہوا جس پر انڈین کاونسل ایکٹ ۱۹۰۹ء مرتب کیا گیا۔ لارڈ مارلے کی یہ اسکیم ہندوستان میں عام طور پر پسند کی گئی اسکے رو سے کاونسل میں ممبروں کی تعداد میں اضافہ ہوا اور سوالات کرنے کا حق ملا اور نیز غیر سرکاری ممبروں کو بجٹ پر تجاویز پیش کرنے کا اختیار بھی دیا گیا۔ علاوہ بریں صوبوں کی کاونسلوں میں غیر سرکاری ممبروں کی کثرت ہوئی۔ اس کے دو سال قبل سے پہلی بار دو ہندوستانی ممبروں کا تقرر وزیر ہند کی کاونسل میں بھی ہو چکا تھا اب مجلس قانون ساز کی جدید اصلاح کے ساتھ وائسرائے کی مجلس منتظمہ میں و نیز مجالس منتظمہ گورنران بمبئی و مدراس میں ایک ایک ہندوستانی ممبر رکھا گیا۔ بنگال میں بھی مجلس منتظمہ قائم کی گئی جس کا ایک ممبر ہندوستانی کیا گیا۔ اسی طرح کی ایک تجویز صوبہ متحدہ میں مجلس منتظمہ بنانے کی بھی پیش ہوئی تھی جسے ہاوس آف لارڈ (دار الخواص) نے صرف ایک ووٹ سے نامنظور کر دیا۔ یہ تجویز ۱۹۱۵ء میں دوبارہ ہوئی۔ یہ بات ضرور ماننی پڑے گی کہ جو اصلاحات ملے وہ خاص طور سے لارڈ منٹو کی کوششوں کے رہین منت ہیں ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ایک امر مسلمہ ہے اور ہمیں خاص طور پر ممنون ہونا چاہیے کہ لارڈ مارلے نے اس کے منظور کرانے میں سخت دقتوں کا سامنا کیا خصوصاً انھیں ایک ہندوستانی کو وائسرائے کی کاونسل (مجلس منتظمہ) کا ممبر بنانے کی منظوری حاصل کرنے میں بہت دقتیں پیش آئیں مگر آپ آخر میں اپنی کوشش میں کامیاب ہوئے۔ سامعین یہ معلوم کر کے بہت ہنسیں گے کہ ہاوس آف لارڈ میں لارڈ لینسڈاون نے جو سابق میں وائسرائے ہند

رہ چکے تھے مخالفین کی سربرآوردگی کرتے ہوئے ان الفاظ میں مخالفت کی "شکایت اس امر کی ہے کہ گورنمنٹ ہند میں بدیشی لایا جارہا ہے" ذرا غور تو کیجئے اور آپ کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ ہند کی گورنمنٹ میں آپ ہندی کو بدیشی بتاتے ہیں۔ بقول خواجہ حافظ "چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد" افسوس تو اس بات کا ہے کہ جس طرح سے ۱۸۹۲ء کے ایکٹ کے تحت میں جو قاعدے مرتب کئے گئے تھے اسی طرح ایکٹ ۱۹۰۹ء کے لئے بھی قواعد مرتب ہوئے اور ان دونوں موقعوں پر ان قواعد نے ایکٹ کے مفاد کو پوری طور پر عمل میں نہ آنے دیا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ سپید چمڑے والوں کی اس جماعت کو جس کے ہاتھ میں اس ملک کی حکمرانی دی جاتی ہے اصلاح کی اصلی منشا پوری نہ ہونے میں کس قدر اور کس حد تک کاوش ہے۔

فرقہ وارانہ نمایندگیاں (الکشن)

کوئی گلاب ایسا نہیں جس میں کانٹے نہ ہوں۔ ایکٹ ۱۹۰۹ء ان بھلائیوں کے ساتھ ایک برائی بھی لے کر آیا جو اب تو ایک مصیبت ہے یعنے وہی فرقہ وارانہ نمایندگی۔ یہ لارڈ منٹو کی جدت ہے۔ ان کی خدمت میں ہندوستان کے تمام مسلمانوں کی جانب سے ایک معتبر وستند وفد سر آغا خان کی سرکردگی میں یکم اکتوبر ۱۹۰۶ء کو باریاب ہوا اس وفد نے انتخاب جداگانہ کی درخواست پیش کی۔ لارڈ منٹو نے فوراً یہ درخواست ناعاقبت اندیشی کے ساتھ منظور کر لی۔ آج یہ بات سب کو معلوم ہو چکی ہے کہ یہ وفد مسلمانوں کی جانب سے اصلی وغیر جانبدارانہ وفد نہ تھا بلکہ اس کی تحریک خود شملہ سے ہوئی تھی۔ یہ صاف ظاہر ہے کہ یہ خوش طبعی چند ذہین افسران ہوم ڈپارٹمنٹ نے اس غرض سے کی تھی کہ ملک کی دو بڑی قوموں کو تقسیم کر کے اصلاح کا اصلی مقصد فوت کر دیا جائے۔ ان لوگوں نے تو اپنی اسی پرانی پالیسی کو پیش نظر

رکھ کر کیا جس پالیسی کو بہت سے غیر سرکاری انگریز صاف صاف کہہ ڈالتے ہیں یعنے "ہیں! اگر ہند و مسلمان مل گئے تو پھر ہمارا کہاں ٹھکانا؟ لارڈ مارلے نے اس وبا کو اس نئی ترکیب سے روکنا چاہا۔ آپ نے اپنے ۱۹۰۸ء کے مراسلہ میں یہ تجویز کیا تھا کہ انتخاب مشترکہ ہو مگر نشستیں محفوظ کر دی جائیں۔ مگر اس تجویز کے خلاف ہندوستان بھر میں مخالفت شروع کر دی گئی۔ خود گورنمنٹ ہند لارڈ مارلے کی اس تجویز کے خلاف تھی پس وہ کسی طرح موافقت پر آمادہ نہ ہوئی۔ علاوہ بریں ہوم ڈپارٹمنٹ میں سرہربرٹ رسل ایسا بااثر و رجعت پسند اعلیٰ حاکم موجود تھا اور مسلمانوں میں تو ایسے بہت سے سربرآوردہ موجود تھے جو بیک کرشمہ دو کار کرنا چاہتے تھے یعنے ان کا خیال تھا کہ انتخاب جداگانہ کے مطالبہ سے ایک تو گورنمنٹ کے وہ حکام جو لارڈ مارلے کی تجویز کے مخالف تھے خوش ہوں گے دوسرے اس کے حاصل کرنے کے بعد انھیں اپنی قوم و ملت کی خدمت کے زیادہ موقعے ملیں گے۔ مسلمانوں نے اپنی مخالفت کا اظہار برابر انگلستان میں بھی کیا یہاں اس کے لیڈر سر آغا خان و مسٹر امیر علی مرحوم تھے۔ مسلمانوں کے اس مطالبہ کے پیروکار دارالعوام میں متعدد ممبر ہو گئے جن میں سے خاص طور پر مارکوس آف زٹلینڈ موجودہ وزیر ہند جو اس وقت لارڈ لارنڈشے تھے اور بعد میں بنگال کے گورنر بھی ہو گئے تھے اور سر ولیم جانسن کہس جو بعد میں وایکاونٹ برنٹفورڈ ہوئے قابل ذکر ہیں۔ مسلمان اپنے مطالبہ میں کامیاب ہو گئے اور لارڈ مارلے کو منظور کرنا پڑا غالباً یہ وجہ تھی کہ اگر اسے نہ مانیں تو پورا بل کا بل مسترد ہو جائے اس لئے کہ ان سے مخالفت بڑھ رہی تھی۔ اس کے بعد سے تو انتخاب جُداگانہ بعض صوبوں میں ڈسٹرکٹ بورڈ و میونسپل بورڈ یعنی لوکل باڈیز میں بھی مزید طور پر جاری ہو گیا ہے۔ اسی پر اکتفا نہیں ہوئی طرفہ تماشہ تو یہ ہے کہ عورتیں جو اس جُداگانہ انتخاب کی انتہائی مخالف رہی ہیں آج ایکٹ ۱۹۳۵ء کے تحت میں ان کی بھی نشستیں

علیحدہ کردی گئی ہیں اور انتخاب جُداگانہ کا جادو ان پر بھی عائد کردیا گیا ہے۔ اس ۲۵ برس کی مدت کا تجربہ جو انتخاب جُداگانہ کے نفاذ سے حاصل ہوا ہے صاف بتا رہا ہے کہ یہ ناپسندیدہ طرز انتخاب ہے۔ ہماری مجالس قانون ساز کو اس انتخاب جُداگانہ کے ذریعے سے مختلف ملل اور انجمنوں و قوموں و فرقوں کے تھوڑے تھوڑے نمایندے بھیج کر جو اپنا اپنا راگ اور اپنی اپنی ڈفلی لئے ہوئے طرح طرح کے راگ الاپ رہے ہوں اور جن کے دل میں اپنے اپنے فرقوں کا جُداگانہ خیال بسا ہوا ہو ہندوستانی قوم کی فلاح کو من حیث القوم اتحادی نقطہ نظر سے اگر نقصان رساں نہیں ہے تو کچھ اور نہیں ہے ایسی مجلسوں کو اگر مختلف اقسام کے نمایندوں کا عجائب خانہ کہا جائے جس میں بھانت بھانت کا جانور بول رہا ہے تو نازیبا نہ ہوگا۔ اِس طرز انتخاب سے منتخب شدہ ممبروں کی کثرت بھی ملک کو کوئی حقیقی فائدہ اس وجہ سے نہیں پہونچا سکتی کیونکہ فرقہ وارانہ ٹولیاں جو کاونسلوں میں آتی ہیں بسا اوقات اپنے اپنے فرقہ کے خیالات میں مستغرق رہتی ہیں جس کی وجہ سے انتخابی پہلو کو نقصان پہونچ جاتا ہے اور صرف نام کی منتخب شدہ ممبران کی کثرت والی مجلس رہ جاتی ہے۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ آیندہ کی مجالس قانون ساز بھی ایسی ہی ہوں گی اور یہی علیحدگی کے راگ الاپے جائیں گے۔

پریس ایکٹ (قانون مطابع)

تھوڑی دیر کے لئے میں سختیوں کے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ ذرا نیرنگی زمانہ تو ملاحظہ ہو کہ مارلے منٹو ایکٹ کے شروع ہوتے ہی جو پہلا قانون نافذ ہوا وہ پریس ایکٹ سنہ ۱۹۱۰ء تھا۔ اس کے نافذ کرنے کے لئے یہ بہانہ کیا گیا کہ تہدید پسندوں کو غیر ذمہ دار و اشتعال انگیز مضامین جو شایع ہو رہے ہیں عوام کو بھڑکا رہے ہیں۔ ع

بہانے ڈھونڈ کے پیدا کئے جفا کے لئے

اور بہت جلد قانون پاس کر دیا گیا۔ پریس بل تو ایکٹ سے بھی زیادہ سخت تھا مگر ہندستانی ممبر قانون (لارڈ سنہا) نے (یہ امر مجھے تحقیق کے ساتھ معلوم ہے) یہ دیکھ کر کہ مجلس منتظمہ میں ان کی رائے کے کم ممبر ہیں استعفا پیش کر دیا۔ اور چونکہ نہ تو لارڈ مارلے اور نہ خود وائسرائے یعنے لارڈ منٹو مسٹر ایس، پی، سنہا (جو بعد میں لارڈ سنہا ہوئے) کو چھوڑنا چاہتے تھے اس لیے آخر میں مصالحت ہوئی اور بل ترمیم ہوکر پریس ایکٹ ۱۹۱۰ء کی صورت میں بالآخر پاس ہوگیا۔ لارڈ سنہا نے بل کی جو مخالفت کی تھی اس پر چند آئی، سی، ایس جو گورنمنٹ آف انڈیا میں اس وقت موجود تھے ان سے سخت ناراض رہے۔ ترمیم شدہ بل سے بھی مسٹر سنہا یک گونہ برداشتہ خاطر تھے اور یہ جانتے تھے کہ مجلس منتظمہ میں اپنا ووٹ وہ ہرگز نہ دیں مگر جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ وائسرائے و وزیر ہند نے ان کی خاطر سے اس قدر ترمیمیں کر دی ہیں تو آخر کار انھوں نے بھی اپنا ووٹ دے دیا۔ اور پریس ایکٹ پاس ہوگیا۔ اب کیا پوچھنا تھا تمام ملک میں مسٹر سنہا کے بارے میں غلط فہمیاں پھیل گئیں اور برسہا برس تک ملامت کی بوچھار آپ پر ہوا کی اور جب آخری جملہ مسٹر ارڈلی نارٹن نے اسی کے متعلق ۱۹۱۹ء میں کیا تو مجھ سے بھی نہیں رہا گیا۔ میں نے اس کی تردید ولایت کے ایک اخبار کے ذریعے سے ان صحیح واقعات کو بتا کر کر دی جو مسٹر گوکھلے نے ۱۹۱۰ء میں اور لارڈ سنہا نے اس کے بعد مجھ سے تصریح کے ساتھ بیان کئے تھے۔ بہرحال اس سے تو شاید ہی کسی کو انکار ہو کہ اس ایکٹ سے بارہ برس تک جب تک کہ یہ ایکٹ نافذ رہا بہت کافی نقصان پہونچا۔ آزاد مطالبہ کے حق میں یہ سم قاتل ثابت ہوا البتہ وہی لنگڑے لولے دلائل ۱۹۳۰ء ۱۹۳۲ء ۱۹۳۵ء میں جب کہ یہی ایکٹ مختلف صورتوں میں یعنے کبھی آرڈینس کی صورت میں کبھی کرمنل لا امنڈمنٹ ایکٹ کے روپ میں اور کبھی اسپشل پاورس ایکٹ کے رنگ میں

آشکارا ہوتا رہا برابر پیش کئے گئے ہیں اور یہ بتایا گیا ہے کہ انصاف پسند و ایماندار صحافت نگار تو اس کی زد میں آہی نہیں سکتا اور سچی نکتہ چینی کے حق میں گورنمنٹ آف انڈیا کا کوئی قانون جس کا تعلق مطابع سے ہو مضرت رساں ہو ہی نہیں سکتا یہ ان خوشامدیوں کے براہین و دلائل ہیں جنھوں نے گورنمنٹ ہند کی ہاں میں ہاں ملانا اپنا شیوہ بنا رکھا ہے اور جو صرف اسی وقت اختلاف کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں جبکہ کوئی امر ہند کے خالص مفاد کے لئے کیا جا رہا ہو۔ اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ ایسوں پر گورنمنٹ بھی حقیقی توجہ نہیں کرتی خصوصاً ان کی اس حرکت کی وجہ سے کہ یہ لوگ کبھی ایمانداری کے ساتھ تنقید نہیں کرتے۔ ایسے صحافت نگاروں کا کیا کہنا۔ انھیں میں سے تو ایک صاحب اس قدر جامہ سے باہر ہوگئے کہ لارڈ مارلے کو "قتل کا شریک" کہہ ڈالا اور اس اڈیٹر کو ذرا سی بھی سزا نہیں دی گئی۔ یہ حقیقت ہے کہ کسی امر پر حق کے ذریعہ سے متصرف ہونے اور کسی کام کو اغماض و چشم پوشی کی وجہ سے کر ڈالنے میں بہت فرق ہے۔ ان تمام قوانین کو جن کا تعلق مطابع سے ہے اور چلا آرہا ہے ہم اس بات کو کہنے پر مجبور ہیں کہ جو کچھ آزاد رائے اخبارات میں گورنمنٹ کی پالیسی پر شایع ہو رہی ہے وہ سب محض اغماض و چشم پوشی کی وجہ سے ہے نہ کہ کسی قانونی حق کی وجہ سے جو کسی قوم کو حاصل ہو سکتا ہے اس کا نتیجہ ہے۔ یہ تمثیل بالکل درست ہے کہ گورنمنٹ نے اپنے اسلحہ خانے میں ہر طرح کے ہتھیار اکٹھا کر لئے ہیں جن سے جس وقت چاہے ہمیں نشانہ نہایت آسانی کے ساتھ بنا سکتی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اسلحہ کا استعمال بہت شاذ و نادر ہوتا رہا ہے اور اگر کوئی محب وطن کچھ کرتا ہے تو اپنے سر اس کی ذمہ داری لے کر کہنے کو تیار ہوتا ہے اس مقام پر یہ کہنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ پریس ایکٹ کے نافذ ہوتے ہی بنگال کے محبان وطن جو ۱۹۰۸ء میں جلاوطن کردئے گئے تھے بغیر کسی روبکاری و بغیر کسی کارروائی کے بے داغ بری کردئے گئے۔

تقسیم بنگال کی منسوخی

۱۹۱۱ء اس وجہ سے ضرور قابل ذکر سال ہے کہ شاہنشاہ معظم جارج پنجم نے ۱۲ دسمبر ۱۹۱۱ء کو تقسیم بنگال کی پوری کارروائی کا دہلی دربار کے موقع پر منسوخ کرکے اعلان فرمادیا اور اسی وجہ سے دارالسلطنت کلکتہ سے دہلی منتقل ہوگیا۔ یہ ضرور ہے کہ بنگال میں کچھ ایسے لوگ تھے جو بہار اور اوڑیسہ و چھوٹا ناگپور کی علیحدگیوں اور دارالسلطنت کی منتقلی کے خلاف تھے پھر بھی بنگال کی عام رعایا لارڈ کرزن کی مردود و تنفرانگیز تقسیم بنگال کی کارروائی کی منسوخی سے بہت خوش تھی اس سال کانگریس کلکتہ میں ہوئی اور اس کے صدر پنڈت بشن نرائن در نے تمام ملک کی جانب سے اہل بنگال کو اپنے مخصوص انداز میں ان الفاظ میں ہدیۂ تہنیت و مبارکباد پیش کیا۔

" اس واقعہ سے محض بنگال ہی نہیں بلکہ سارا ملک متاثر ہوا ہے۔ بنگال کا معاملہ تمام ملک سے متعلق ہے اور سارے ملک کا معاملہ ہے۔ اس کی کامیابی حقیقی طور پر انصاف کی کامیابی ہے جو بے بنیاد پاسداری پر حاصل ہوئی ہے اور اس سے یہ امر آشکارا ہے کہ وفادارانہ طور پر و نیز قانون کی عظمت کرتے ہوئے آئینی جد وجہد کامیابی کی کنجی ہے۔ بنگال نے ایک دلیرانہ جد وجہد ایک بہت زبردست ناانصافی کے خلاف کی ہے اور اس نے نہایت شاندار فتح حاصل کی ہے۔ یہ کامیابی ہمارے حاکموں کی انصاف پسندی اور حقیقت پسندی کا نتیجہ ہی نہیں ہے بلکہ اس کی اصلی وجہ وہ قابل تقلید دلیری و ایثار بھی ہے جو ہمارے محبان وطن نے اس طوفان و آلام و مصائب کی تاریک بدلی میں و قربانی خواہ تردداث کے وقت کئے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ اعتماد و وثوق کے ساتھ اپنے یقین کو برطانوی انصاف و عدل میں رکھ کر

تکالیف برداشت کرنا بھی اس کا سبب ہے - ہمارے محبان وطن و رہنماؤں کو وہ عدیم المثال کامیابی حاصل ہوئی ہے جو آئینی جد و جہد کا نمونہ بن کر جدید ہند کی تاریخ میں ہمیشہ چمکے گی اور جو تمام ملک کے لئے باعث تقویت و مسرت قائم و سالم رہے گی"۔

ایک دردناک واقعہ کا ذکر بھی جو دسمبر ۱۹۱۲ء میں ہوا کیا جاتا ہے :-

جب لارڈ ہارڈنگ تمام تزک و احتشام، خدم و حشم کے ساتھ دلی میں جو نیا دارالسلطنت قرار دیا گیا تھا داخل ہو رہے تھے تو آپ پر ایک بم کا گولہ گرایا گیا جس سے آپ کو سخت ضربات پہونچیں مگر واہ رے تحمل و نیک طبعی - آپ اس واقعہ سے ذرا بھی متاثر نہیں ہوئے آپ نے اس فراخ حوصلگی - بردباری و دریا دلی و نیز وسیع النظری سے کام لیا جس کی مثال چراغ لے کر ڈھونڈی جائے تو شاذ ہے اور آپ ہندوستان کے فلاح و بہبود کے لئے اُسی طرح کوشاں و سرگرم رہے جیسے کہ قبل میں تھے -

جنوبی افریقہ کی جد و جہد

اسی زمانہ میں جبکہ ہندوستان اس قدر بدگمانیوں اور شورش کا جولانگاہ بنا ہوا تھا ہمارے ہم ملکوں کی حیثیت پر جنوبی افریقہ میں زوال آرہا تھا - اس وقت نہ تو برطانوی گورنمنٹ کو اور نہ بویروں کے دل میں انھیں جائز ملکی حق دینے کا خیال تھا - خود مختار حکومت کے معنی جنوبی افریقہ کے تھوڑے سے سپید چمڑے والوں کو حکومت دینے کے تھے نہ کہ ہندوستانی باشندوں کو دینا -

جنوبی افریقہ کی جنگ کے دوران میں لارڈ لینسڈاون نے جو اس وقت وزیر جنگ تھے کچھ دلاسا دیا تھا اور فرمایا تھا کہ کروگر صدر کے زمانے میں جو ہندوستانیوں کے ساتھ بے انصافیاں ہوئی ہیں ان سے وہ بہت زیادہ متاثر تھے - دونوں بویر پبلک کے شامل ہونے کے بعد ایسے بہت سے دوسرے امید افزا وعدے فراموش کردئے گئے۔

لارڈ ملنر تو اس مٹی کے بنے ہی نہیں تھے جس کے بنے ہوئے محکوم قوم کے باشندوں کا کوئی حق تسلیم کرتے ہیں اور انصاف و غیر جنبہ داری سے کام لیتے ہیں لارڈ کورٹنی کے قول کے مطابق تو وہ "کھوٹے ہوئے انسان تھے"، رفتہ رفتہ ہندیوں پر ناانصافیوں کی بوچھاریں شروع ہوگئیں اور حد تحمل سے گذر گئیں۔ مگر مسٹر گوکھلے نہایت دلیری سے جد و جہد کرتے رہے حالانکہ کوئی معنی خیز نتیجہ نہیں نکل رہا تھا آخر کار انھوں نے ۱۹۱۳ء میں مقاومت مجہول کے لئے عظیم الشان تیاریاں شروع کیں۔ ہندستان میں مسٹر گوکھلے جد و جہد منظم کرتے رہے اور یہ بات قابل فخر ہے کہ مادر وطن کی عزت و آبرو کے تحفظ کے مسئلہ میں اپنی خالص حب وطنی کا ثبوت دامے درمے قدمے سخنے ہر طرح سے دیا۔ مسٹر گوکھلے و مسٹر گاندھی نے اپنے خوب خوب جوہر دکھائے مزید براں خود لارڈ ہارڈنگ نے یہ کہہ کر کہ جنوبی افریقہ میں جو برتاؤ ہندوستانیوں کے ساتھ ہو رہا ہے اس کے خلاف مقاومت مجہول ایک نہایت کارگر و سیاسی طریقہ ہے ہمیں مرہون منت کیا۔ آخر میں جنرل اسمٹ نے صلح کر لی جس کی بنا پر مسٹر گاندھی ہندوستان واپس آئے۔ اس کے دوسرے ہی سال یہ معلوم ہوا کہ یونین گورنمنٹ نے شرائط صلح کی خلاف ورزیاں شروع کر دی ہیں۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندیوں کے خلاف پالیسی برابر جاری رہی اور بعض اوقات معاملات میں گتھیاں پڑیں جن کے سلجھانے کے لئے کانفرنسیں بھی ہوا کیں اب تھوڑے دنوں سے جنوبی افریقہ میں گورنر جنرل ہند کا ایک ایجنٹ (نمائندہ) بھی رہنے لگا ہے پہلے ایجنٹ رائٹ آنریبل سرینواس شاستری تھے اور حال میں سر مہاراج سنگھ رہے ہیں۔

آپ نے ایک رپورٹ پیش کی ہے جس میں بتایا ہے کہ ایجنٹ کچھ کر نہیں سکتا ہے اس لئے یہ جگہ توڑ دی جائے۔ ہر ایک ایجنٹ نے حتی الوسع حالات کے درست کرنے و معاملات کو سلجھانے میں پوری کوششیں کی ہیں اور بیشک اس کا

دُور و دراز ملک میں رہ کر ایسی خدمات کا انجام دینا ہماری شکر گذاری کا مستحق قرار دینا ہے۔ ایک بات تو صریحی ہے۔ تا وقتیکہ ہم اپنے ملک میں حکومت خود اختیاری حاصل نہ کرلیں ہمیں اس کی امید ہی نہیں رکھنی چاہئے کہ جو ہمارے ہم وطن دوسری جگہ جا بسے ہیں ان کے ساتھ دوسری قومیں مہذب قوموں کے اچھے برتاؤ سے پیش آئیں گی۔ ہندوستانیوں کی جنوبی افریقہ کی تاریخ مشرقی افریقہ میں و نیز دیگر ممالک قلمرو برطانیہ میں دُہرائی جا رہی ہے۔

بایں ہمہ گورنمنٹ ہند ہمیشہ ان ہندیوں کے لئے جو بیرونجات میں جا کر آباد ہو گئے ہیں وطن پرست گورنمنٹ کی طرح جد و جہد کرتی رہی ہے اگرچہ اُس کو کوئی خاص کامیابی اب تک نہیں ہوئی ہے۔ پھر بھی جس قدر گورنمنٹ ہند نے کیا ہے اِس سے زائد اس کے امکان ہی میں نہیں ہے۔ گورنر جنرل معہ اپنی مجلس منتظمہ کے گورنمنٹ انگلستان کا ماتحت ہے بھلا یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ وہ اپنے ان آقاؤں کی پالیسی کے خلاف کسی وقت کچھ کر ڈالے جو انگلستان میں رہتے ہیں۔

مسٹر سی، ایف، انڈروز

جنوبی افریقہ کی ۱۹۱۳ء کی جد و جہد میں ہماری عملی سیاست میں ایک عظیم الشان ہستی آکر شریک ہوئی جس کا شریک ہونا کسی سیاسی نقطۂ نگاہ سے نہ تھا بلکہ خالص جذبہ انسانیت نے اُسے شرکت پر مجبور کیا یہ وہ شخص ہیں جن کا ذکر بغیر انتہائی تعریف انتہائی عظمت و انتہائی محبت کے نہیں کیا جائیگا۔

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لئے

یہ میرے معزز دوست پادری - سی، ایف، انڈروز ہیں کیا مجال کہ آپ سے واقف ہو کر کوئی شخص آپ سے محبت نہ کرے یا آپ کی عزت اس کے دل میں نہ ہو۔

ابتک میں ایسے کسی دوسرے شخص سے نہیں ملا جو مسٹر انڈر روز سے زیادہ مجسمہ ایثار ہو یا جس میں انانیت نام کو نہ ہو یا جس میں قوم۔ رنگ وکھال کی امتیازی فوقیت بالکل نہ پائی جاتی ہو۔ ۱۹۱۳ء میں مسٹر انڈر روز دہلی کے سینٹ اسٹیفنسن کالج میں پروفیسر تھے اسی زمانہ میں جنوبی افریقہ میں جو صعوبتیں ہندیوں کو برداشت کرنی پڑ رہی تھیں ان کی دلدوز و درد آلود کہانیاں جو روزانہ اخبارات میں شائع ہو رہی تھیں ان سے وہ بیحد متاثر ہوئے اور آپ نے مسٹر گوکھلے سے ملاقات کی۔ ساتھ ہی ساتھ پندرہ سو روپیہ کی تھیلی انھیں پیش کر کے آپ نے یوں فرمایا "جو کچھ بھی میرے پاس تھا وہ سب یہ ہے براہ مہربانی اسے قبول فرمائیے اور اس رقم کو جنوبی افریقہ بھیجدیجئے۔ اب میرے پاس کچھ نہیں ہے کاش اور ہوتا"

مسٹر گوکھلے نے یہ رقم جو مسٹر انڈر روز کی مایۂ بضاعت اور زندگی بھر کی کمائی تھی لینی نہ چاہی اور یہ کہا کہ اس چندہ سے بڑھ کر آپ زیادہ کار آمد کام وہاں جاکر کرسکتے ہیں یہ امداد کا زیادہ مؤثر طریقہ ہے۔ مسٹر انڈر روز۔ مسٹر ڈبلو، ڈبلو پیرسن کے ساتھ کالج سے استعفا دے کر جنوبی افریقہ کو فوراً روانہ ہوگئے وہاں ان کی ملاقات مسٹر گاندھی سے ہوئی اسی زمانے سے مسٹر انڈر روز۔ مہاتما گاندھی و ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور کو اپنا گرو مانتے ہیں۔ دنیا کا شاید ہی کوئی ایسا گوشہ ہوگا جہاں آپ ہمارے ہم وطنوں کی امداد کے لئے تشریف نہ لے گئے ہوں۔ بیشک مسٹر انڈر روز اسی مادہ پرست زمانے میں ایک سچے رشی ہیں جن کا از حد شکریہ جس کے وہ مستحق ہیں ہم ادا ہی نہیں کرسکتے۔ آپ کی وہ ذات گرامی منزلت ہے جو انسانیت و جذبہ انسانیت کی جانب سے ہمیں ہر طرح سے مطمئن کئے ہوئے ہے۔

جنگ عظیم

جنگ عظیم ۱۹۱۴ء میں شروع ہوئی۔ انگلستان کی شرکت ایک معاہدہ کی بنا پر جو ۱۸۳۹ء میں ہوئی تھی جس سے انگلستان

بلجیم کی آزادی قائم رکھنے پر مجبور تھا ہوئی۔ جرمنی کے استبداد پسند چانسلر نے اس صلحنامہ کو ردی کاغذ کے برابر بھی نہ خیال کیا حالانکہ اس صلح میں جرمنی بھی شریک تھا۔ ہاں ہم ہندوستانیوں کو بھی برطانیہ سے ایسی ہی بہت سی شکایتیں ہیں جہاں بہت سے پکے وعدوں کا خیال نہیں کیا گیا ہے۔ بااین ہمہ اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ انگلستان نے باوجود اس کے کہ وہ لڑائی کے لئے پورے طور پر تیار نہ تھا اور نہ کوئی خاص وجہ تھی کہ وہ جرمنی یا آسٹریا سے دشمنی مول لے اس آفت خیز و انقلاب انگیز جنگ میں شریک ہو جانا طے کر لیا۔ اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ برطانوی اقتدار پر آگے چل کر ضرب لگنے والی تھی جس کی وجہ سے بہت پہلے انگریز اس آفت میں کود پڑے۔ تین برس بعد امریکہ بھی جرمنی کی آب دوز کشتیوں کی زبردستیوں سے پریشان ہو کر جنگ میں شامل ہو گیا۔ انگلستان کی شرکت کے دو پہلو تھے۔ ایک فرائض شناسی دوسرا قومی منفعت کا تحفظ اسی طرح سے ہندوستان کو بھی اس جنگ عدیم المثال میں جس میں بڑی بڑی مصیبتوں کا منہ دیکھنا پڑا جس میں ایثار عظیم برداشت کرنے پڑے فرائض شناسی و تحفظ کے لحاظ سے شریک ہونا پڑا۔ ہندوستان نے جو تعجب خیز تیاری کا مظاہرہ کیا اور جس آمادگی سے برطانوی معاملہ کو اپنا ٹھہرایا اس سے برطانوی مدبرین کے قلوب بہت متاثر ہوئے جس پر اظہار تشکر مدبرین برطانیہ نے پارلیامنٹ میں اور اس کے باہر کیا۔ ان میں ہر ایک نے آزادی۔ مساوات انصاف اور بین الاقوامی (Democracy) قوانین کی تعریف میں دریا بہا دئے۔ وزیر اعظم مسٹر ایسکویتھ نے فرمایا "ہم اس امداد کا جس کے لئے ہندوستانی آمادہ ہیں محبت و امتنان کے ساتھ خیر مقدم کرتے ہیں۔ ہمارا تعلق ایک ایسی سلطنت سے ہے جس میں کسی مذہب۔ ملت۔ ذات پات کی تفریق نہیں ہے۔ ہم سب متحدہ طور پر

شاہنشاہ معظم کی یکساں رعایا ہیں اور سب کے سب ان کے مال و متاع عظمت و فوائد کے یکساں محافظ و بہرہ دار ہیں" وائکاونٹ ہارکورٹ جو نوآبادیات کے سکریٹری تھے فرماتے ہیں" برطانوی قوم اچھی گورنمنٹ و ہر ملک کی قومی گورنمنٹ (سلف گورنمنٹ) کی دل سے خواہاں ہے" مسٹر مانٹیگو نے ہندوستان و برطانیہ کے نزدیک جو یکساں و متحدہ آزادی کا نصب العین و وفاداری ہے اس پر تقریر فرمائی - دیگر مدبرین نے اکثر و بیشتر ایسے زوردار الفاظ میں تقریریں کیں جس کے بعد ہندوستان کو امید ہوگئی کہ جنگ کے اختتام پر ہندوستان کو بہت کچھ ملے گا. مسٹر تلک لڑائی شروع ہوتے ہی رہا کر کے اپنے وطن بھیجدیے گئے - آپ نے تمام ہندوستان سے انگلینڈ کو وفادارانہ امداد کرنے کے لئے اپیل کی. مگر سچ تو یہ ہے کہ ترقی کی منزل عشق کی منزل سے بہت مشابہ ہے - لڑائی سے پہلے اس کے دوران کے لمبے چوڑے وعدوں - تمام خدمات و وفاداریوں کے معاوضہ میں دوبارہ سختیاں شروع کردی گئیں - پھر کیا تھا - بے اطمینانی نے گوناگوں اسباب و علل کی وجہ جس میں اقتصادی وجوہات کا پلّا بھاری تھا گھر دیکھ پایا -

ہندوستانی سکھوں کے ساتھ جو برٹش کولمبیا میں آباد تھے ایسے برے برتاؤ کئے گئے کہ سب واپس آئے اور آکر انھوں نے مخالفین کی تعداد میں بہت اضافہ کردیا - کوما گاٹا ما واقعہ سے وہ لوگ واقف ہیں جو سیاسیات میں حصہ لیتے رہے ہیں - بنگال کے تہدیدیوں کی تحریک دب نہیں گئی تھی بلکہ زور پکڑ گئی تھی - ڈفنس آف انڈیا ایکٹ (ہندوستان کی محافظت کا قانون) انگلستان کے "ڈفنس آف ریالم ایکٹ کی طرح پاس کیا گیا جس کے تحت میں گورنمنٹ کو کسی شخص کو بغیر کسی روبکاری - مقدمہ یا سماعت کے نظربند کردینے کا اختیار حاصل ہوگیا - اس اختیار کا پورا استعمال شروع کردیا گیا - اہل ہند متردد اور پریشان ہوکر پوچھنے لگے

کہ کیا ہندوستان کی خدمات و وفاداریوں کا یہی صلہ ہے۔ (مولانا محمد علی اور شوکت علی بھی دوران جنگ میں نظر بند کر دیئے گئے۔ مترجم)

مسز اینی بسنٹ

اسی ۱۹۱۶ء میں ہندوستان کی عملی سیاسیات میں ایک نئی قوت کا ظہور ہوا۔ یہ مسز اینی بسنٹ کی قوت تھی۔ آپ کی خداداد معجز نما قوتوں کا مظاہرہ ان کاموں سے کافی طور پر ہو چکا تھا جنھیں آپ پہلے انگلستان و ہندوستان میں انجام دے چکی تھیں۔ آپ کو اعلیٰ دماغی قوت، علم و فضل، زبردست قوت ارادہ، مضبوط قوت کامیابی، عدیم المثال دلیری ساتھ ساتھ بدرجہ اتم قدرت نے ودیعت کی تھیں اور جب تک کہ آپ اپنے مقصد میں بین کامیابی حاصل نہ کرلیتیں آپ کے قدم پیچھے ہٹتے ہی نہ تھے۔ ان تمام باتوں کے اوپر آپ کی قوت لسانی و سحر بیانی سونے میں سہاگا تھی۔ آپ کبھی خاموش بیٹھ ہی نہیں سکتی تھیں آپکے دل و دماغ میں سیمابی و متحرک کیفیت ہمہ وقت موجود تھی آپ نے پرانے روزنامہ "مدراس اسٹینڈرڈ" کو خرید لیا اور اس کا نام بدل کر "نیو انڈیا" رکھا اور روزانہ تحریر و تقریر کے ذریعہ سے آپ نے بیداری کی ایک لہر ملک بھر میں دوڑا دی جو شاید ہی کسی اور سے ممکن ہوئی۔ آپ کو ایک بات کی سہولت اور حاصل تھی یعنے تھیا سوفیکل سوسائٹی کی عنان آپ کے ہاتھوں میں پہلے سے موجود تھی اور یہ سوسائٹی تمام دنیا میں پھیلی ہوئی تھی اور ایک بہت منظم انجمن تھی اس کے ساتھ ہزارہا پڑھے لکھوں کو آپ سے براہ راست عقیدت تھی ان پڑھے لکھوں میں مرد و عورت دونوں ہزاروں کی تعداد میں تھے جو آپ کے ایک اشارے پر آپ کی نئی تحریک میں کام کرنے، آپ کا ہاتھ بٹانے و نیز آپ کی پوری پوری مدد کرنے کے لئے ہمہ تن تیار تھے۔ معمولی باتوں میں دلچسپی آپ کی جبلت کے خلاف بات تھی۔ آپ نے اس میدان میں اپنے بہت سے پرانے ساتھیوں کو بہت

پیچھے چھوڑ دیا جن پر آپ اکثر طعن کسا کرتیں اور انھیں "دیروزہ اصحاب" کے لقب سے یاد کرتیں۔ آپ نے "ہوم رول لیگ" کی بنیاد ڈالی اس کی شاخیں تمام ملک میں پھیلائیں اور نہایت درخشاں مگر بیباکانہ تحریر کے ذریعہ سے بہت سے رسالے۔ کتابیں اسی کے متعلق بانٹتی رہیں اس پر سے برابر ملک بھر میں آج یہاں ہیں کل وہاں ہیں دورے کرتی رہیں۔

۱۹۱۷ء کے وسط میں آپ مسٹر ارنڈیل و واڈیا کے ساتھ نظر بند کردی گئیں۔ چونکہ ۱۹۱۵ء کی بمبئی کانگریس میں کانگریس کے آئین میں خاطر خواہ تبدیلیاں کردی گئی تھیں اس لئے مسٹر تلک ۱۹۱۶ء میں معہ اپنے جملہ ماننے والوں کے کانگریس میں آکر شریک ہوگئے۔ اس وقت کے معلوم تھا کہ مسٹر تلک و مسز بسنٹ کی اس بڑی تعداد کے ساتھ شرکت اور اس کے علاوہ لالہ لاجپت رائے، مسٹر سی، آر داس اور دیگر اکابرین شرکایان کانگریس کی پالیسی میں ایسا انقلاب پیدا کردے گی جس سے ان حضرات کے پرانے ساتھیوں کو کانگریس میں شریک رہنا ناممکن سا ہوجائے گا۔ اس بات کا پتہ ہمیں ۱۹۱۷ء کی کانگریس میں کلکتہ میں جس کی صدر مسز بسنٹ تھیں چلا اور یہ وہیں معلوم ہوگیا کہ نئے طرز و طریقے جو کام کرنے کے طے ہو رہے ہیں ان کی وجہ سے یہ کانگریس ہمارے لئے ہو نہ ہو آخری کانگریس ہے۔ چنانچہ یہی ہوا۔

نئی اصلاحیں

۱۹۱۶ء میں لارڈ ہارڈنگ کے جانشین لارڈ چیمسفورڈ ہوئے جنھوں نے نئی آئینی اصلاحوں کی ایک قسط کے معاملہ کو اپنے ہاتھوں میں لیا۔ اب ہمارے قدیم بہی خواہ حضرات آئی، سی، ایس کی مٹھی میں تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو اسکیم پیش ہوئی اس کی ہر سطر پر بس یہی سمجھئے لکھا ہوا تھا کہ "قدم احتیاط پھونک کر رکھو"

آہستہ خرام بلکہ مخرام

یہ اسکیم بس کچھ ایسی ہی تھی کہ وائسرائے کی مجلس منتظمہ کے ہندوستانی ممبر سر سنکارن نیر نے اس کے خلاف ایک معرکۃ الآرا نوٹ لکھا ۔ یہی نہیں بلکہ رجعت پسند وزیر ہند مسٹر (موجودہ سر) آسٹن چیمبرلین نے بھی اسے ناکافی قرار دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وائسرائے نے وزیر ہند کو ہندوستان آ کر یہاں کے اہل الرائے اور اکابرین سے مل کر معاملات وحالات کو بچشم خود دیکھ کر ایک اسکیم تیار کرنے کے لئے مدعو کیا۔ اسی درمیان میں مسٹر چیمبرلین کو عراق کمیشن کی رپورٹ کی وجہ سے مطعون ہو کر اپنی جگہ چھوڑ دینی پڑی۔ اس رپورٹ میں گورنمنٹ ہند پر عدم اعتماد کا اظہار اس وجہ سے کیا گیا تھا کہ عراق میں فوج نے بڑے طریقے اختیار کئے تھے اور شایان شان تیاریاں عراق میں فوج نے نہیں کی تھیں جو گورنمنٹ ہند پر حرف رکھ رہی تھیں۔

مسٹر مانٹیگو کا تقرر

اس کے بعد مسٹر مانٹیگو وزیر ہند مقرر ہوئے۔ اس تقرری کی خاص اہمیت ہے اس لئے کہ اس کے چند یوم قبل آپ نے دار العوام میں عراق کے مباحثہ پر بحث کرتے ہوئے گورنمنٹ ہند کی پالیسی پر سخت عدم اعتمادی کا اظہار کیا تھا اور گورنمنٹ ہند کو "کاٹھ کی اور دقیانوسی،، گورنمنٹ کہا تھا۔ مسٹر مانٹیگو لارڈ مارلے اور لارڈ کرو کی ماتحتی میں نائب وزیر ہند رہ چکے تھے اور دوسرے نائب وزرا کی طرح نہ تھے۔ باوجودیکہ انڈیا آفس میں تقرر کے وقت آپ کی عمر صرف ۳۱ سال کی تھی پھر بھی آپ نے تھوڑی سی مدت میں ہندوستانی مسائل سے گہری دلچسپی لے کر عمدہ معلومات حاصل کر لیں۔ دار العوام میں بجٹ پر ان کی تقریریں اعلیٰ قابلیت وانتہائی ذہانت کا ثبوت دیتی تھیں آپ ۱۹۱۲ء میں ہندوستانی معاملات سے ذاتی واقفیت حاصل کرنے اور یہاں کے لوگوں سے مل کر خاص حالات کا اندازہ حاصل کرنے کے لئے آ چکے تھے۔

یہاں آپ نے اپنی آزادی رائے اور ہندوستانیوں کے لئے ہمدردی کے جذبات کا اظہار فرمایا تھا جس کی وجہ سے آپ کے بہت سے دوست ہوگئے تھے۔ اب تو صاف ظاہر تھا کہ ایسے وزیر ہند کے تقرر پر کس قدر اظہار مسرت ہوا ہوگا اور یہ سچ ہے کہ کم از کم آپ کی تقرری پر جو امیدیں کی گئی تھیں وہ پوری ہوئیں۔ آپ کا پہلا مشہور کارنامہ اعلان مورخہ ۲۰ اگست ۱۹۱۷ء تھا جس میں صاف طور پر ظاہر کر دیا گیا تھا کہ ہندوستان کو ذمہ دار سلطنت دینا برطانوی پالیسی کا مقصد قرار دیا جا چکا ہے اس کے دوسرے ہی دن دوسرا اعلان شائع ہوا جس نے ہندوستانیوں کو فوج میں کمیشن کی جگہوں کا دینا بلا لحاظ قومیت کے منظور کر لیا۔ تیسرا کارنامہ مسز بسنٹ اور ان کے ساتھیوں کی رہائی تھی اس کے بعد آپ ایک مضبوط وفد کے ساتھ ہندوستان آئے۔ وائسرائے سے مشورہ کیا حکامان گورنمنٹ ہند و گورنروں سے ملے بہت سی انجمنوں کے وفدوں کو شرف باریابی بخشا بہت سی انجمنوں کے سپاس نامے قبول کئے آئینی اصلاحات کے متعلق بہت سے لوگوں سے ہر پہلو پر باتیں کیں اور یہاں ۶ ماہ قیام کر کے اپنی و لارڈ چیمسفورڈ کی مشترکہ رپورٹ معہ ان کے دستخط کے تیار کرا کے لے کر انگلستان واپس گئے۔

سب سے زیادہ اہم وفد و سپاس نامے جو مسٹر مانٹیگو کی خدمت میں پیش ہوئے آل انڈیا کانگریس کمیٹی و آل انڈیا مسلم لیگ کی جانب سے تھے ان دونوں میں آپس میں مصالحت ہوگئی تھی اور دونوں نے متفقہ کارروائی کی تھی۔ جون ۱۹۱۸ء میں مشترکہ (مانٹیگو چیمسفورڈ رپورٹ) شائع ہوئی۔ سمند ناز کو ایک اور تازیانہ ہوا اس رپورٹ پر ہندوستانی مدبرین میں اصلاحات شروع ہوئے۔ رایوں میں اصلاحات پیدا ہوئے جو آئندہ چل کر تفریق و ٹولیوں کے پیش خیمہ بنے اب صاف صاف دو پارٹیاں ہوگئیں۔ ایک کا خیال تھا کہ باوجود ان خامیوں کے جو رپورٹ میں

پائی جاتی ہیں (اس میں کسی کو تامل نہ ہوگا کہ موجودہ و مروجہ نظام سے اس میں بین ترقیاں موجود ہیں البتہ مرکزی گورنمنٹ کے متعلق جو سفارشات ہیں ان میں تبدیلیاں ہونی چاہئیں) مگر پھر بھی ہندوستان کی فلاح و بہبود کے لئے ان اصلاحات کو قبول کرنا ضرور چاہئے تاکہ مسٹر مانٹیگو اپنی کوشش میں کامیاب ہوں اور ان کی ہمت افزائی بھی ہو۔ دوسری پارٹی پوری اسکیم کو نامنظور کر رہی تھی اور سب رایوں سے زیادہ صاف رائے مسز بسنٹ نے اپنے نیو انڈیا میں ظاہر کی اور کہا "اس کا ایجاب نہ تو انگلستان کے شایان شان ہے اور نہ اس کا قبول ہندوستان کی شان کے مطابق ہو سکتا ہے۔"

کانگریس کا ایک خاص اجلاس بمبئی میں منعقد ہوا جس میں اس تحریک (اسکیم) کو مسترد کرتے ہوئے ایک تجویز ان الفاظ کے ساتھ پاس ہوئی "اسکیم ناکافی غیر اطمینان بخش اور امید کش ہے۔"

لبرل جماعت کی بنیاد

یہ وہ وقت تھا جب کہ پرانے کانگریسی ایک جگہ بیٹھ کر یہ طے کریں کہ آیا اس مخصوص اجلاس میں وہ شریک ہوں یا نہ ہوں۔ ان لوگوں نے آپس میں مشورے کئے۔ بہت غور و خوض کیا اور یہ طے پایا کہ ملک کی خدمت کانگریس کی خدمت سے زیادہ اہم ہے۔ کانگریس محض ملک کی خدمت کا ایک ذریعہ ہے اور خدمت ملک خود زیادہ وقیع ہے۔

آخر کار اس اجلاس میں نہ شریک ہونا ہی طے ہوا۔ اور یہ بھی طے ہوا کہ اس اسکیم کو نامنظور نہیں کرنا چاہئے بلکہ اس پر عمل کرنا چاہئے جس کے طرز و طریقوں پر مزید غور و تفحص کرنے کے لئے اپنی ایک علیحدہ کانفرنس کرنا ضروری سمجھا گیا۔ اسی جماعت میں کچھ ایسے بھی تھے جن کی رائے تھی کہ کانگریس سے علیحدگی اس وقت تک نہ اختیار کی جائے جب تک کہ کانگریس میں شریک ہوکر ہار نہ جایا جائے۔ بہرصورت

کوئی شخص بھی ہمیشہ کے لئے کانگریس سے علحدہ ہونے کا خیال نہ کرتا تھا۔ مگر حالات نے اس علحدگی کو مستقل کر دیا۔ پرانی پارٹی کی الگ کانفرنس بمبئی میں نومبر میں سر سریندر ناتھ بنرجی کی صدارت میں ہوئی۔ اس اجلاس میں کانگریس کے سابق صدر حضرات کی ایک جماعت شریک ہوئی تھی اور نہایت مشرح و واضح تجاویز پاس ہوئیں جس میں مانٹیگو کی اسکیم کی خامیاں ظاہر کر دی گئی تھیں اور اپنی تنقید و تبصرہ کے بعد یہ صاف صاف بتا دیا گیا تھا کہ سب باتوں کا خیال کرتے ہوئے اسکیم منظور کی جاتی ہے۔

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۱۹ء

اپریل ۱۹۱۹ء میں گورنمنٹ آف انڈیا بل جوائنٹ رپورٹ کی سفارشات پر مرتب ہو کر دار العوام میں پیش ہوا۔ یہ رپورٹ سے کہیں زیادہ امید شکن تھا لبرل جماعت (یہ نام پرانے کانگریسیوں نے ان کے لئے تجویز کیا تھا) فوراً اس میں تبدیلیوں کے لئے تیار ہو گئی تاکہ ہندوستانیوں کی خواہش کے مطابق اس میں خاطر خواہ تبدیلیاں پیدا ہو جائیں ان لوگوں نے اس کے لئے بہت زور دیا۔ مسٹر سریندر ناتھ بنرجی کی رہنمائی میں ان لوگوں کا ایک وفد انگلستان روانہ ہوا جس کے متعدد ممبروں نے جوائنٹ سلکٹ کمیٹی کے روبرو اس بل پر شہادتیں دیں۔ کانگریس اور ہوم رول لیگ کے بھی علحدہ علحدہ وفد گئے۔ ہوم رول لیگ کی جماعت نے مسز بسنٹ کی قیادت میں امسال گذشتہ سال سے مینٹگو اسکیم کی زیادہ موافقت کی اور اس کے وفد کے ممبروں میں سے مسز بسنٹ۔ مسٹر (اب سر) سی۔ پی۔ راما سوامی ایر و لبرل ممبران وفد نے مل جل کر کام کئے کانگریس کی جانب سے مسٹر وی۔ پی۔ مادھو راؤ اور وی۔ جی۔ پٹیل نے گواہی دی۔ یہ گواہیاں جوائنٹ سلکٹ کمیٹی کے اس قدر خلاف مزاج ہوئیں کہ گورنمنٹ آف انڈیا

ایکٹ ۱۹۱۹ء کا آخری حصہ وعنوان انھیں شہادتوں کا نتیجہ ہوا اور طرفہ تماشہ تو یہ ہے کہ وہی عنوان اب موجودہ ایکٹ میں بھی شامل کر دیا گیا ہے۔ دسمبر ۱۹۱۸ء میں لارڈ سنہا نائب وزیر ہند مقرر کیے گئے تھے لارڈ سنہا اور مسٹر مانٹیگو دونوں جوائنٹ سلکٹ کمیٹی کے ممبر ہوئے۔ میں اپنی ذاتی معلومات کی بنا پر وثوق کے ساتھ کہوں گا کہ ان دونوں حضرات نے بہت زیادہ کوششیں کیں تکلیفیں اٹھائیں اور جہاں تک حالات کے لحاظ سے امکان میں تھا ان دونوں نے ایکٹ کو ہندوستانی محبان وطن کی منظوری کے لائق بنایا مسٹر مانٹیگو کی قابلیت وانہماک کے ہم سب ممنون ہیں کہ لبرل وفد کو انگلستان میں نمایاں کامیابیاں ہوئیں۔ موصوف بیشک ہر طرح کی تعریف وشکریہ کے مستحق ہیں۔

مسٹر مانٹیگو

مسٹر مانٹیگو ہندوستان کے ایک غیر معمولی دوست تھے جب آپ ہندوستان تشریف لائے تھے اور آپ کی اسکیم تیار ہو رہی تھی مجھے آپ سے ملنے اور باتیں کرنے اور نیز مباحث سیاسیات پر گفتگو کرنے کے متعدد موقعے نصیب ہوئے۔ میں سر سنکارن نیر جو اس وقت خود گورنمنٹ آف انڈیا میں تھے اور دوسرے گورنمنٹ آف انڈیا کے افراد سے جن میں سے سر جارج لائڈ لینڈ میرے محب خالص سر ولیم میر تھے۔ مسٹر مانٹیگو کی زبردست شخصیت، اثرات قابلیت اور اخلاص کے بارے میں سُن چکا تھا۔ انگلستان میں مجھے جوائنٹ سلکٹ کمیٹی اور انڈیا آفس میں کام کرتے ہوئے دیکھنے کے اور بھی موقعے ملے۔ میرے دوست سر تیج بہادر سپرو نے مجھ سے اُن امداد کا اعتراف کیا ہے جو مسٹر مانٹیگو نے پہونچائی تھیں خصوصاً جبکہ سپرو صاحب گورنمنٹ آف انڈیا کے نمائندے بن کر امپیریل کانفرنس ۱۹۲۳ء میں گئے تھے اور جس میں کینیا اور جنوبی افریقہ میں ہندوستانیوں کے حقوق کی بابت مباحث چھڑے۔ میں اپنی ذاتی معلومات کی بنا پر اور جو کچھ کہ میں نے سُنا ہے

بہ بانگ دہل کہوں گا کہ تمام وزراء ہند میں مسٹر مانٹیگو کی پہلی اور سب سے مقدم جگہ ہے ۔ یہ ضرور ہے کہ ان سے بڑی بڑی شخصیتوں نے اس جگہ کو مثل لارڈ سالسبری اور لارڈ مارلے نے مزین کیا تھا اور اس میں بھی شک نہیں کہ پہلوں میں لارڈ مارلے اور بعد والوں میں مسٹر وج اوڈ بین ضرور ہند کے دوست تھے مگر اب تک کوئی مسٹر مانٹیگو سا ہندوستانیوں کی خدمت کا دلدادہ اور ان کی محبت میں سرشار نہیں ہوا۔ اگر یہ کہا جائے کہ آپ کو ہندوستان کا عشق تھا تو زیادہ مناسب ہے۔ آپ کی وفات سنہ ۱۹۲۴ء میں واقع ہوئی جب آپ کی عمر صرف ۴۵ سال کی تھی۔ آپ کو اس بات کا بہت قلق ہوا کہ ہندوستانیوں نے آپ کی خدمات کا کچھ بھی اعتراف نہیں کیا بلکہ ترش روئی سے آپ کی پالیسی کو مردود قرار دیا جن کے لئے آپ نے کیا کچھ نہ قربانیاں کی تھیں ان کے ہم وطنوں نے آپ کی مخالفت کا طوفان اس وجہ سے برپا کر رکھا تھا کہ آپ کو وہ سب کے سب نامناسب ہندی علم بردار کہتے تھے اور ہندوستانی تو آپ کے خلاف ہو چکے ہی تھے ۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ سیاست میں شکریہ حاصل کرنا یا کسی شکریہ کی امید رکھنا اک فعل عبث ہے ۔ یہ وہ منزل ہے جہاں قدم قدم پر ملامت ۔ قربانیوں ۔ ایثار اور بدنامیوں کی گنجان جھاڑیاں ہیں جن میں انسان کا دامن الجھ جاتا ہے ۔ یہ وہ راہ ہے جس میں تشکر و امتنان کے لہلہاتے پھول نہیں دکھائی دیتے بلکہ یہ وہ وادی ہے جس میں نکتہ چینیوں کے ہمت شکن اور دل دوز بوچھاڑوں کو سر پر اوڑھنا پڑتا ہے پھر بھی کچھ خوش نصیب ایسے ملیں گے جو فولاد کا دل رکھ کر اس راہ کو اپنا مسلک قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں ؎

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے ہزارہا شجر سایہ دار راہ میں ہیں آتش

رولٹ ایکٹ

میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ ترقی کی راہ ہموار نہیں ہے جس کا صاف ثبوت سنہ ۱۹۱۹ء بکار بکار دیگار رولٹ کمیٹی کی تجاویز کی بنا پر مجلس قانون ساز

میں ایک ایسا بل پیش کیا گیا کہ جس سے رعایا کی پوری آزادی سلب ہو رہی تھی۔ تمام ملک میں گوشہ گوشہ سے چیخ پکار شروع ہوئی شاید ہی کوئی غیر سرکاری ممبر ایسا رہا ہو جس نے اس کی نہایت سختی سے مخالفت نہ کی ہو مگر گورنمنٹ نے کچھ سماعت نہ کی اور اسے قانون بنا ہی دیا۔ یہ قانون تین سال کے لئے جاری کیا گیا تھا اور اس کی یہ دفعہ کہ خود گورنمنٹ ہند کو اس کی کسی دفعہ کو اس تین برس کی مدت میں مسترد کرنے کا حق نہ ہوگا صاف بتا رہا تھا کہ جو کچھ بھی ہوا وہ محض گورنمنٹ کی ضد اور ہٹ دھرمی تھی باوجودیکہ اس کے خلاف جو عدیم المثال احتجاج ہوا اس سے خود گورنمنٹ کو متنبہ ہونا چاہئے تھا۔ اس ناعاقبت اندیشی، کوتاہ نظری واستبدادیت کی وجہ سے جو اہم واقعات سامنے آئے آگے بتائے جائیں گے۔

اکابرین دور

اب میں اس دَور کے سیاسی اکابرین کا ذکر کرنا چاہتا ہوں اس سے اس امر کا لحاظ رکھنا چاہئے کہ جن لوگوں کی بابت پہلے کہا جا چکا ہے ان میں سے اکثر اس دَور میں رہ کر سیاسی کارہائے نمایاں انجام دیتے رہے ہیں اور چند جن کا ذکر اب کیا جا رہا ہے ان میں سے اکثر پہلے بھی بڑے بڑے کام کرتے رہے ہیں۔

بال گنگادھر تلک

اس دَور کے لئے سیاسی قائدین میں سے جس کی شخصیت نے قلوب پر اپنے کارناموں اور خیالات کا سکہ بٹھا دیا مسٹر بال گنگادھر تلک تھے۔ قدرت نے انھیں جنگجو پیدا کیا تھا اور آپ پورے مرہٹہ تھے۔ آزادی ان کی زندگی کی آرزو تھی جس نے آپ کے قلب کو بے چین بنا رکھا تھا۔ آپ کا خیال تھا کہ گورنمنٹ کی اچھی بات پر بھی تعریف نہ کی جاوے ورنہ جد وجہد کی اسکیم ماند پڑ جائے گی۔ اس لئے اکثر اوقات جن باتوں کو اور جس طرح آپ کسی مجمع میں کہتے وہ آپ کی ذاتی رائے کے مترادف نہ ہوتیں۔

اور یہی وجہ ہے کہ بنگال بائیکاٹ کی تحریک کے خلاف ہوتے ہوئے بھی آپ اس تحریک کے بڑے حامی تھے۔ آپ کو مانٹیگو اسکیم منظور تھی مگر کبھی کسی مجمع میں اس کا اظہار نہ کرتے تھے۔ آپ انتہائی درجہ کے ذہین تھے اس کے ساتھ آپ کی اصابت رائے اور قوت ارادی اس غضب کی تھی کہ جس بات پر اُڑ گئے اس سے ہٹ جانا یا اُسے چھوڑ دینا محال تھا

آپ کے نزدیک اپنے مقصد کے حاصل کرنے میں ہر ذریعہ کا اختیار کرنا اور کسی نہج اور طریقہ سے منزل مقصود کو پہونچنا روا تھا۔ آپ ایک اچھے آقا مگر خراب رفیق تھے اور آپ کے ساتھ وہی کام کر سکتے جو آپ کی ہر قدم پر عظمت قبول کیا کرتے اور یہی وجہ تھی کہ اپنے برابر والوں کے ساتھ آپ تعاون نہ کر سکتے البتہ آپ اچھے لیڈر اور قائد تھے۔ اور اپنے مرہٹی اخبار "کیسری" کے ذریعہ سے ان لوگوں پر جو آپ کے خیالات آپ کی رائے یا آپ کے طریقوں سے اختلاف کرتے۔ برابر بلا تامل حملے کرتے۔ اس دور میں کوئی ایسا نہ تھا جس کی آپ سے زیادہ تعریف ہوتی یا آپ سے زیادہ اس کے ماننے والے ہوتے یا آپ سے زیادہ اس سے نفرت کی جاتی۔ گورنمنٹ تو آپ کو ہندوستان میں سلطنت برطانیہ کا سب سے بڑا دشمن سمجھتی تھی۔ مسٹر مانٹیگو نے مجھ سے خود کہا تھا کہ مسٹر تلک کے تمام حالات اور کاموں کے مطالعے اور مشاہدے نے انھیں یہ یقین دلا دیا تھا کہ اگر ہندوستان میں کوئی تعجیل پسند تھا تو وہ مسٹر تلک تھے۔ تمام معاصرین سیاست دانوں اور رہنماؤں سے زیادہ آپ نے اپنی رائے اور اپنے طور وطریقے کی وجہ سے تکلیفیں سہیں اور گھاٹے اُٹھائے۔ مگر کیا مجال کہ ہند کی آزادی کا جھنڈا آپکے ہاتھوں سے چھوٹ جائے یا اس کے چھوٹ جانے کا خیال آپ کے دل ودماغ میں بھولے سے بھی آجائے آپ نے اس کے لئے اپنی زندگی وقف کردی تھی اور

اسی کی چوکھٹ پر اپنی تندرستی کو بھینٹ چڑھا دیا۔ آپ سے زیادہ کوئی دوسرا شخص اس دَور کا نہیں تھا جس سے لوگوں کو زیادہ اختلاف رہا ہو اور یہ اختلافات مختلف پہلوؤں سے تھے۔ مگر مورخ اس کے کہنے پر مجبور ہے کہ آپ سے زیادہ قوی ارادہ اور قوت کے ساتھ اور آپ کے مقابلے میں زندگی بھر کی ملک کی خدمت کسی دوسرے شخص نے مستقبل ہند کے سوراج کے لئے کوشش نہیں کی ہے۔ اختلاف رائے لابدی اور ضروری بات ہے مگر جب قومی آزادی کا خیال آئے گا تو اُسی کے ساتھ بال گنگا دھر تلک کے نام کا آنا بھی لابدی ہے اور ہند جدید کے بنانے والوں کی فہرست میں ہر شخص مجبور ہے کہ آپ کو ایک بہت بلند جگہ دے۔

لالہ لاجپت رائے

پنجاب کی سیاسی زندگی میں لالہ لاجپت رائے کی سب سے زیادہ نمایاں زندگی تھی۔ آریہ سماج کے ایک ایک فرد کی حیثیت سے آپ نے دیانند اینگلو ویدک کالج کے لئے بڑی بڑی قربانیاں کیں۔ آپ ایک سرگرم معاشرتی مجدد تھے۔ آپ صحافت نگار تھے۔ آپ موثر مقرر تھے۔ پبلک مقرر کی حیثیت سے میں آپ کا نام لائڈ جارج کے نام کے ساتھ لوں گا۔ عوام کو ورغلانے اور غضبناک کرنے میں یہ دونوں یکساں ہیں۔ عوام کے دماغ پر جہاں تک اثر ڈالنے کا تعلق ہے میں نے لالہ لاجپت رائے کی تقریروں کے مقابلے میں جو اُردو میں ہوتیں شاید ہی کوئی دوسری تقریر سنی ہوگی۔ ان کی بعض تقریروں کا تقابل لائڈ جارج کی لائم ہاؤس اور مائل اینڈ کی تقریروں سے پورے طور پر ہوسکتا ہے۔ ایک بار کانگریس میں تین تقریریں ایک دوسرے کی ہموزن ہوئیں یہ کانگریس ۱۹۱۲ء میں پٹنہ میں ہوئی تھی۔ موضوع بحث ہندوستانیوں کی حیثیت جنوبی افریقہ میں تھا۔ اُسی سال مسٹر گوکھلے جنوبی افریقہ کا دَورہ کرکے اور حالات سے ذاتی طور پر واقفیت حاصل کرکے آئے تھے۔ مسٹر گوکھلے نے ۴۵ منٹ کی ایک اسپیچ دی جس میں ایک

تجویز پیش کی میں نے اس سے زیادہ پُر اثر، تنفر انگیز، صاف اور شستہ تقریر مسٹر گوکھلے کو کبھی کرتے ہوئے نہیں سُنا تھا۔ یوں تو مسٹر گوکھلے کی ہر تقریر انتہائی ذکاوت کا ایک آئینہ ہے مگر یہ اسپیچ سب سے بڑھی چڑھی تھی۔ میں نے مسٹر گوکھلے کو اس سے زیادہ خشمگیں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کے بعد پنڈت مدن موہن مالوی نے ہندی میں تقریر کی جس میں بہت سے مظالم کا جو ہندوستانیوں پر جنوبی افریقہ میں ہوتے تھے بیان کیا اور سامعین میں سے ہر شخص کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ اور شاید ہی کوئی ایسا پتھر کا دل رہا ہو جو اس وقت نہ پسیجا ہو۔ اس کے بعد لالہ لاجپت رائے کی باری آئی۔ اب تو عالم ہی دوسرا تھا آپ نے تو سامعین کو اپنی جادو بیانی سے اس قدر برافروختہ کر دیا کہ اگر سامعین کو اس وقت کہیں جنوبی افریقہ کے گورے چمڑے والے مل جائیں تو بس ان کی جان کی خیریت نہیں۔ لالہ لاجپت رائے کے ساتھ گورنمنٹ نے جو دشمنی دکھائی اُس کے وہ مستحق نہ تھے۔ لڑائی کے دوران میں اور کوئی اس کے ڈیڑھ سال بعد تک آپ تقریباً جلا وطن رہے۔ جب آپ کو اپنے وطن واپس آنے کی اجازت ملی تو آپ نے اپنی پُرانی سرگرمیاں دوبارہ مگر مناسب طور پر شروع کر دیں اور بعض اوقات آپ آئینی اصول اور نان کوا پریشن کے اصولوں کے انتخاب میں پس و پیش کرتے رہے اور ایک طریقہ میں تو آپ اپنے کانگریسی ساتھیوں سے اختلاف کرتے ہی رہے۔ آپ نے ہندو مفاد کو کبھی ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ ہندو مسلم اتحاد کے بہت بڑے حامی اور مؤید تھے مگر اپنے فرقہ کے مفاد کو اس اتحاد کی قیمت قرار دینا آپ کا کبھی شیوہ نہیں رہا آپ کی موت نہایت اندوہناک اسباب سے ہوئی۔ لاہور میں جب آپ سائمن کمیشن کے بائیکاٹ کے مظاہرہ میں شریک تھے۔ آپ پر بے دردی سے حملہ کیا گیا اس کے کوئی پندرہ دن بعد آپ نے انتقال فرمایا۔ میں خود ان لوگوں میں سے ہوں جن کا خیال ہے کہ آپ کی توہین

اس وجہ سے جلدی ہوئی۔ پنجاب میں آپ نے کوئی مناسب جانشین نہیں چھوڑا اور آپ کی موت نے ہمارے ملک کو اور غریب و بے نوا بنا دیا۔

آر۔ین۔مُدلکر

امراوتی کے مسٹر آر۔ین۔مدلکر اس دَور کے دوسرے سیاسی قائد تھے۔ آپ وثوق کے ساتھ اعتدال پسند تھے۔ آپ ۲۱ سال تک کانگریس کے فدائی تھے اور پُونا کے اُس اجلاس کے جس کا ذکر میں نے کیا ہے صدر رہ چکے تھے۔ امراوتی میں مَیں خود آپ کے ساتھ تینؔ سال تک رہ چکا ہوں اور میری سچی رائے ہے کہ آپ کو ملک کی پائدار اور سچی محبت تھی اور آپ اس کے فلاح و بہبود میں اسی طرح کوشاں اور منہمک تھے جیسا کہ کوئی اور دوسرا محب وطن ہو سکتا ہے۔ آپ ملک کے مفاد کے لئے مختلف شعبوں میں ایک ہی انہماک کے ساتھ یعنے صنعت و حرفت۔ تعلیم۔ معاشرتی اصلاحات و سیاسیات میں حصہ لیتے رہے۔ آپ کے وطن صوبہ برار کو آج تک دوبارہ ایسا سپوت، ایسا مایۂ ناز فرزند نصیب نہیں ہوا۔

موتی لال گھوش

بنگال کے لیڈروں میں بابو موتی لال گھوش اور اسوینی کمار دت خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ بابو موتی لال گھوش کا اُن کے اخبار امرت بازار پترکا کی وجہ سے زبردست اثر تھا اور آپ نے صحافتی تنقید کا ایک نیا طریقہ ایجاد کیا تھا۔ آپ کا طرز نگارش اچھوتا تھا جس میں نہ تو بڑے بڑے دقیق الفاظ ہوتے نہ اس میں بلیغ پیرائے تھے نہ زبان یا طرز ادا مشکل پسند تھا بلکہ اس کے برعکس سیدھے سادے الفاظ۔ معمولی طرز ادا۔ بولتے ہوئے چھوٹے چھوٹے جملے ہوتے۔ اس پر سے ان کے قصے تو غضب ہی کے ہوتے۔ جب آپ کسی کا مذاق اُڑانے پر تُل جاتے تو بس قصوں سے پناہ نہ تھی۔ اور قصوں کا وہ ذخیرہ آپ کے پاس تھا جس کی کوئی حد و نہایت ہی نہیں تھی۔

آپ کھلم کھلا تعجیل پسند تھے - آپ پبلک پلیٹ فارم پر بہت کم آتے مگر آپ کا اثر صوبہ بنگال میں سبھوں سے زیادہ تھا البتہ پرانوں میں بیشک سریندر ناتھ بنرجی اور نیوں میں مسٹر سی - آر داس کے اثر سے کم تھا -

اسوینی کمار دت بار یسال کے اسوینی کمار دت جو ۱۹۰۸ء میں جلا وطن کر دئے گئے تھے اپنی شخصیت کی وجہ سے ایک مجسمہ قوت تھے - آپ کو تعلیم پر بہت تیقن تھا اس لئے آپ نے اپنے وطن کے قصبے میں ایک کالج کھولا اور اسے اپنے باپ کے نام سے منسوب کیا - آپ بہت بڑے مذہبی شخص تھے اور آپ نے کبھی کوئی ایسا کام نہیں کیا جو بالکل ایماندارانہ اور مخلصانہ نہ ہو - عام مفاد کے کسی کام میں مسٹر اسوینی کمار دت نے کسی خود غرضی کو دور سے بھی پھٹکنے نہیں دیا - بیسوں برس قبل سے کانگریس میں شریک رہ کر تقسیم بنگال کے وقت آپ نے خاص شہرت حاصل کی - چونکہ آپ مشرقی بنگال کے باشندے تھے اس لئے تقسیم بنگال کا مسئلہ جس سے آپ کا صوبہ علٰحدہ ہو رہا تھا آپ کا اپنا کام ہو گیا - آپ نے بچشم خود ان سختیوں کو دیکھا تھا جو وہاں ہو رہی تھیں علاوہ بریں حکام کی ناخوشی کے آپ خود نشانہ بن چکے تھے تقسیم بنگال کی مخالفت کی تحریک میں تمام لیڈروں میں آپ کی بہت نمایاں حیثیت تھی اور اپنے صوبہ میں تو آپ کے ایثار - انہماک اور عدم انانیت نے وہ مقبولیت حاصل کر لی تھی کہ آپ کی رائے، آپ کی آواز اور آپ کا حکم عوام الناس کے لئے قانون تھا - بمقابلہ دوسرے صوبوں کے بنگال بدیشی نمک کا زیادہ محتاج تھا - باریسال میں سب سے زیادہ بائیکاٹ کی تحریک کامیاب تھی - دوکانداروں نے قطعی طور پر ہر بدیسی چیز کا بیچنا بند کر دیا تھا یہاں تک کہ نمک کا قطعی بائیکاٹ تھا - بدیسی نمک ملتا نہیں تھا ضلع کے کلکٹر کو کھانے کے لئے

نمک نہیں ملا تو اس نے ایک دوکاندار کے لئے نمک بیچنے کی اجازت مسٹر دت سے چاہی - مسٹر اسوینی کمار جب ہندوستانی نمک نہ مل سکتا بغیر نمک کا کھانا کھاتے۔ آپ نے ملک کے لئے اپنی زندگی وقف کردی تھی اور آپ کی حب وطنی اور آپ کا طرز معاشرت بنگال کی تاریخ میں آب زر سے لکھے ہوئے ہیں -

دیگر خدام خلائق سر راس بہاری گھوش ۱۸۸۶ء سے کانگریس میں شریک تھے مگر کوئی ۲۰ - ۲۵ برس تک عملی کاموں میں حصہ نہیں لیا تھا - محبان وطن کے زمرہ میں آپ سب سے زیادہ ادیب تھے اور آپ کی تقریریں نہایت دلچسپ ہوتیں - علاوہ بریں یہ تقریریں قابلیت - خود مختاری اور اصابت رائے کی گنجینہ ہوتیں - سر راس بہاری گھوش اور سر تارک ناتھ پالت نے جو شاہانہ عطایا کلکتہ یونیورسٹی کو دئے ہیں اُن کی وجہ سے آپ کے نام ہمیشہ تشکر کے ساتھ ہندوستان میں لئے جائیں گے -

لارڈ سنہا کبھی بھی سرگرم قومی لیڈر یا کارکن نہ تھے مگر اس دَور کے حالات آپ کا ذکر کئے ہوئے بغیر ناتمام رہیں گے - کلکتہ ہائیکورٹ میں - برسٹروں میں سب سے اول تھے - آپ کی قوت وکالت بلا کی تھی - اس ملکہ وکالت کی دوسری مثال نہیں ملتی اور اگر مل سکتی ہے تو وہ صرف مسٹر گوکھلے کی قوت مکالمہ تھی خصوصاً جبکہ وہ کسی قومی معاملہ پر بحث کرتے - لارڈ سنہا کانگریس پلیٹ فارم پر صرف دو بار دکھائی دئے - پہلی بار ۱۸۹۶ء میں اور دوسری بار ۱۹۱۵ء میں - آپ کو جو منصب بلند و بالا نصیب ہوئے وہ کسی دوسرے ہندوستانی کو آج تک نہیں ملے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ان منصبوں کے لئے آپ نے کوئی کوشش نہیں کی - ان میں سے چند ایسے بھی تھے جن کو قبول کرنے کے لئے آپ کے احباب نے آپ کو مجبور کیا - آپ کے محامد و محاسن، آپ کی ذکاوت اس پایہ کی

تھی۔ جس نے نہ صرف ہندوستان ہی میں بلکہ انگلستان میں خراج تحسین و عظمت حاصل کیا تھا۔

پونا کے راؤ بہادر جی، وی، جوشی جس شہرت کے وہ مستحق تھے انھیں حاصل نہیں ہوئی۔ آپ ایک گورنمنٹ اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے پھر بھی آپ نے اسٹیٹکس کا بہت وسیع اور عمیق مطالعہ کیا تھا اور سیاسی مسائل پر آپ کو وہ ملکہ حاصل تھا جس کی دوسری مثال مشکل سے مل سکتی ہے۔ آپ اخبارات میں "جے" کے فرضی نام سے برابر مضامین لکھا کرتے جسے سیاسی مسائل کے شائقین انتہائی دلچسپی سے پڑھا کرتے۔ آپ نے مسٹر راناڈے اور مسٹر گوکھلے کو مالیات اور اقتصادیات کے مسائل میں بہت مدد دی۔ پنشن لے کر آپ مسٹر تلک کی پارٹی میں شریک ہو گئے۔ آپ کے مضامین کی ایک ضخیم کتاب ہے جسے ہندوستانی مسائل کے شائقین کو ضرور پڑھنا چاہیے۔

مدراس کے دیوان بہادر یل، اے، گوند رگھوا ایر نے سیاسی زندگی ۱۹۰۱ء میں شروع کی اور کانگریس و مجلس قانون ساز دونوں جگہوں میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ آپ نہایت اچھے مقرر نہایت صحیح رائے قائم کرنے والے اور نہایت معقول بات کہنے والے تھے اسی کے ساتھ آپ بہت زیادہ مذہبی تھے اور سخاوت اور فراخدلی آپ کا شیوہ تھا حالانکہ آپ کوئی امیر کبیر نہ تھے مگر سخاوت کا یہ عالم تھا کہ آپ کی زندگی کا آخری زمانہ غربت و افلاس میں کٹا۔ میرے دیکھنے میں آپ سے زیادہ متواضع۔ منکسر مزاج۔ صاف باطن اور صاف گو کوئی دوسرا شخص اب تک نہیں آیا ہے۔ کیا مجال کہ کوئی شخص آپ سے واقف ہو اور آپ کے ساتھ محبت اور آپ کی عظمت نہ کرے۔

جو دَور اس وقت زیرِ تبصرہ ہے اس میں مسٹر بوکنتھا تھ سن برہم پور کے۔

مسٹر امبکا چرن موزمدار فرید پور کے اور مسٹر بھوپندر ناتھ باسو کلکتہ کے سیاسی کاموں میں انہماک کے لئے بہت مشہور ہیں۔ ان لوگوں نے کانگریس کی ممبری اس کے شروع ہی زمانے سے اختیار کر لی تھی اور ۱۹۱۸ء تک جبکہ علیحدہ ہوئے اس کے پہلے برابر سرگرم ممبر رہے۔ بابو بیکنتھناتھ سین ۱۸۹۷ء کی کانگریس کی مجلس استقبالیہ کے صدر تھے اور مسٹر امبکا چرن موزمدار صدر لکھنؤ کانگریس ۱۹۱۶ء میں اور مسٹر بھوپندر ناتھ باسو صدر کانگریس مدراس میں ہوئے۔ یہ دونوں زور دار مقرر تھے۔ مسٹر امبکا چرن موزمدار نے قومی تحریک کی تاریخ لکھی ہے جس کا نام "ہندوستانی قومی ارتقا" (انڈین نیشنل ... ہے) میں آپ کی تقریر کا ایک جملہ بطور نمونہ درج ذیل کرتا ہوں جو آپ کی اس تقریر سے لیا گیا ہے جو آپ نے ۱۸۹۷ء کی کانگریس میں سیڈیشن بل کی مخالفت کرتے ہوئے کی تھی۔

"حضرات۔ ہم کس کے لئے اور کس کے واسطے باغی ہوں گے۔ کیا مغلوں کی کوئی پرچھائیں اب بھی باقی ہے جو ہمیں ہلالی جھنڈے کو دہلی کی دیواروں پر بلند کرنے کے لئے ترغیب دے رہی ہے۔ کیا دکن میں کوئی پیشوا اب بھی باقی ہے جو مرہٹہ سلطنت کا خواب دیکھ رہا ہے۔ تو پھر ہم کس کے لئے باغی بنیں .... حضرات ہم اس قوم سے تعلق رکھتے ہیں جس کے آبا و اجداد اپنے بچوں کو اپنے بادشاہ کی مفروضہ بھلائی کے لئے بھینٹ چڑھا دیا کرتے تھے ہم ایسوں سے وفاداری کا سبق سیکھنا اپنے لئے ننگ خیال کرتے ہیں جن کی آزادیوں سے شاہوں کے خون کی بو آتی ہے۔"

بنگال کے بابو بپن چندر پال صحافت نگار اور مقرر دونوں تھے۔ آپ عرصہ تک تعجیل پسند اور انتہا پسند طبقہ سے تعلق رکھتے تھے مگر مرنے سے کوئی ۶-۷ سال قبل

آپ تعجیل پسندوں اور کانگریس سے علیٰحدہ ہو گئے تھے۔ دیگر مشاہیر سیاست میں سر گنگا دھر چتنویس اور سر بپن کرشن بوس ناگپور کے اور سر نرسمہا شرما اسس شہر (وزاگاپٹم) کے تھے۔

مطابع اس دور کے اخبارات پر پہلے سے زائد قیود عائد تھے مگر پھر بھی اخبارات قوت پکڑتے گئے اور قومی کاموں کے صلہ میں انھیں زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی بیشک اخبارات نے قومی تحریک کی خدمات دیانتداری اور سرگرمی سے انجام دیں۔ اپنے نئے مالک مسٹر کستور نگا ایر کے ہاتھوں میں "ہندو" نے روز افزوں زور پکڑا۔ دیوان بہادر سی۔ کرنکار مینن کے ہاتھوں میں ہندو کی عنان ادارت ۸ سال تک رہی اس سے پہلے مسٹر مینن بسٹر سبرامینا ایر کی ماتحتی میں ۸۔ ۹ سال تک کام کر چکے تھے۔ اس کے بعد آپ نے اپنا ذاتی اخبار "انڈین پٹیریٹ" نکالا جو نہ چلا مگر اپنی تھوڑی سی عمر میں اسے سارے ملک میں شہرت عام اس کے مضامین کی معنویت کی وجہ سے حاصل تھی۔

مسٹر کرنکار مینن ان صحافت نگاروں میں سے تھے جنھوں نے ہندوستان میں صحافت نگاری کا رتبہ بلند کر دیا ہے۔ مسز بسنٹ نے "مدراس اسٹینڈرڈ" کو خرید کر کے ہوم رول لیگ کا مستقل یومیہ محرک بنا دیا مگر اس کے ساتھ ہی ایک ہفتہ وار "کامن ویل" نامی بھی جاری کر دیا جو نہایت مفید اور کارآمد کام اپنی محدود زندگی میں برابر کرتا رہا۔ سر فیروز شاہ مہتا نے بمبئی میں "بمبئی کرانیکل" مسٹر بی۔ جی۔ ہارنمین ایسے کہنہ مشق، قابل اور با اثر اڈیٹر کی ادارت میں جاری کیا۔ صوبہ متحدہ میں پنڈت مدن موہن مالوی نے "لیڈر" نکالا یوں تو ہندوستان اور خاصکر پنجاب کی خدمت لاہور کے "ٹربیون" نے خوب کی۔ ٹامل اضلاع میں "سودیشی مترن" عام طبقہ میں خوب مقبول ہوا دکن میں "کساری" نے بہت ترقی کی اور متعدد

بنگالی اخبارات کی اشاعت جن معنوں میں ہندوستان میں مستعمل ہے بہت وسیع ہوئی۔ "گجراتی" نے انگریزی کے صفحات شائع کرکے مسٹر نرائن وشنو گوکھلے کی نگرانی میں جو خدمات انجام دی ہیں ان کا اعتراف میں ضرور کروں گا۔ مسٹر وشنو گوکھلے کی رگ و پے میں شرافت سرایت کئے ہوئے تھی۔ اسی طرح آپ ایک قابل اور اچھے قومی کارکن تھے۔ آپ بڑے سخت لبرل تھے۔



فصل چہارم

۱۹۱۹ء سے ۱۹۳۵ء تک

نان کواپریشن اور اُس کے بعد

مقاومت مجہول رولٹ ایکٹ کے پاس ہوتے ہی مسٹر گاندھی سیاسی اکھاڑے میں آ اُترے - جنوبی افریقہ میں مقاومت مجہول کی کامیابیوں نے اُن کا دل بڑھا رکھا تھا جسے آپ نے بردولی (گجرات) اور چمپارن (بہار) میں محدود دائروں میں آزما بھی لیا تھا اب تو دل اور بڑھتا تھا آپ نے اس کو بڑے پیمانہ پر آزمانے کے لئے باوجودیکہ موقع نہ تھا طے کر لیا - اور رولٹ ایکٹ کے خلاف ستیہ گرہ شروع کر دی آپ نے اس کے بارے میں جن لوگوں سے مشورہ کیا تھا ان میں سے اکثروں نے آپ کو یہ جتا دیا تھا کہ اس کا محل نہیں ہے باوجودیکہ انگریزوں کے خلاف اس قدر گہرا جذبہ موجود ہے پھر بھی لوگوں میں ستیہ گرہ کے باریک اور لطیف اصول کا پورے طور سے سمجھنے کا ادراک نہیں ہے بہت ممکن ہے کہ اس کی وجہ سے بے امنی زیادہ پھیل جائے، پھر کچھ نہ بن پڑے اور فائدے کے

بجاے بہت زیادہ نقصان کا شدید احتمال ہے۔ ایک شخص نے تو یہ کہا کہ 'ستیہ' صرف آپ ہی تک محدود ہے اور بقیہ 'گرہ' ان لوگوں کا کام ہوگا جو عمل پیرا ہوں گے۔ مگر آپ نے کچھ نہ سُنی محض باد ہوائی ڈھکوسلے کی طرح اُڑا دیا۔ اور ستیہ گرہ کی مورچہ بندی شروع کردی۔ اصل نتیجہ اس احتمالی نتیجہ سے بدتر ہوا۔ بلوے۔ لاہور۔ امرتسر۔ اور پنجاب کے دیگر مقامات میں احمد آباد گجرات میں اور متعدد جگہوں میں شروع ہوگئے جس میں جان و مال کے کثیر نقصانات کے علاوہ ایسی شرمناک بدمعاشیاں ہوئیں جو کسی مہذب قوم کے لئے باعث ننگ قرار دی جاویں گی۔ اس پر مسٹر گاندھی کو بہت صدمہ پہونچا اور آپ نے کھلم کھلا اپنی اس "بلند ترین غلطی کا جسے آپ نے ہمالین بلنڈر کے نام سے یاد کیا۔ اعتراف کیا۔ اس وقت سر مائیکل اوڈائر پنجاب کے لفٹنٹ گورنر تھے جو ترقی پذیر خیالات اور ہمدردانہ اطوار و عادات کے نہ تھے۔ یہ استبداد پسند حاکم تھے۔ تدبر اور دور اندیشی سے انھیں کوئی حس و مس نہ تھا اور لڑائی میں بھرتی کرنے میں انھوں نے صوبہ پنجاب کو تنگ کرکے تھکا مارا تھا۔

اگر لوگوں نے زیادتیاں کیں تو گورنمنٹ بھی ایسی حرکات میں پیچھے نہیں رہی۔

مارشل لا (فوجی قانون)

مارشل لا جو قانون کا فقدان اور بے قانونی زیادتیوں کی انتہا ہے جاری کیا گیا اور اس سختی اور مظالم سے کام لیا گیا کہ تمام ملک میں تنفر کی لہر دوڑ گئی۔ ڈائر نے جلیان والا باغ میں جو مظالم کئے وہ خود آپ اپنی مثال ہیں۔ ایک سال بعد ہنٹر کمیٹی کے سامنے و نیز کانگریس کی تفتیش کمیٹی کے سامنے جو گواہیاں ہوئیں اُن سے کسی کو ذرہ برابر بھی شبہہ نہیں رہا کہ حکام نے لوگوں کو ذلیل کرنے اور تکلیف پہونچانے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا۔ سر سیوا سوامی ایر جو بہت تول کر الفاظ استعمال کرتے ہیں اور جنھیں اپنے فریق مخالف کی غایت ہمدردی کے الفاظ کہنے میں ایک عادت سی

ہو گئی ہے اس کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں ۔

"نہتے سیکڑوں آدمیوں کا بلاتفریق حالت بے بسی میں اور بغیر یہ بتائے ہوئے کہ مجمع منتشر ہو جائے جلیان والا میں سفاکانہ قتل جنرل ڈائر کی مجروحین کے ساتھ بے رخی اور بے توجہی ۔ ان لوگوں پر جو منتشر ہو کر بھاگ جانا چاہتے تھے ان پر مشین گن سے گولہ باری ۔ لوگوں کو عام جگہوں پر دُرّے لگوانا ۔ طلبہ کو ۱۶ میل پا پیادہ چلاکر حاضری کے لئے بلوانا ۔ ۵۰۰ طلبہ اور پروفیسروں کی گرفتاریاں ۔ ۵ ۔ ۷ برس کے بچوں کو قواعد کرا کے جھنڈے کی سلامی لینا ۔ مارشل لا کے پوسٹروں کے تحفظ کو لوگوں کی خاندانوں کو ضمانتیں قرار دینا ۔ ایک بارات کو درّے لگوانا ۔ ڈاک کی جانچ ۔ بادشاہی مسجد کو ۶ ہفتے تک بند کر دینا ۔ لوگوں کی بلاوجہ گرفتاریاں اور اُن کو حوالات میں بھر دینا خصوصاً ایسے لوگوں کو جنھوں نے جنگ میں روپے پیسے یا کسی اور طریقہ سے گورنمنٹ کی مدد کی تھی ۔ اسلامیہ اسکول کے ۶ بڑے لڑکوں کو کوڑے لگوانا صرف اس لئے کہ وہ بڑے لڑکے تھے ۔ گرفتار شدہ لوگوں کے لئے ایک کھلا ہوا پنجرہ بنوانا ۔ نئی نئی ترکیبیں سزا کے لئے نکالنا مثلاً پیٹ کے بل چلوانا اور دوسرے طریقے سزا کے اختیار کرنے جواب تک کہیں نہیں ہوئے تھے ۔ لوگوں کو ہتھکڑیوں اور رسّیوں میں جکڑنا اور ۱۵ گھنٹے تک مقید رکھنا ۔ ہوائی جہازوں ۔ لوئی بندوقوں اور سائینس کی نئی نئی ایجادوں کے ذریعے سے نہتے آدمیوں کو سزا دینا ۔ لوگوں کی جائدادوں کا مفرورین کے بلانے کی غرض سے ضبط کر لینا ۔ ہندو مسلمانوں کو ساتھ ساتھ ہتھکڑیوں میں جکڑنا اس نیت سے کہ ہندو مسلم اتحاد کا

یہ نتیجہ ہوتا ہے۔ بجلی کی روشنی اور بجلی کے پنکھوں کو ہندوستانی گھروں سے ہٹا کر یورپینوں کو دیدینا اور پانی کا ان پر بند کر دینا۔ ہندوستانیوں کی تمام سواریوں کو یورپینوں کو دیدینا۔ مارشل لا کی میعاد کو ختم کرنے کے لئے نہایت جلدی جلدی مقدمات کا فیصلہ کر ڈالنا۔

مارشل لا کے واقعات میں سے چند تمثیلات ہیں جنھوں نے ایک بھیانک دور حکومت پنجاب میں قائم کر رکھا تھا اور جس سے قوم کی قوم کے دل مجروح ہوئے"۔

(دیکھو "سرکاری گواہوں کی زبانی پنجاب مارشل لا کی کہانی" کا دیباچہ جسے مدراس لبرل لیگ نے ۱۹۲۰ء میں شائع کیا)

نان کواپریشن (ترک موالات)

میں نے ہنٹر کمیٹی کا ذکر کیا ہے۔ یہ کمیٹی مارشل لا کی حکومت کی جانچ کے لئے مقرر کی گئی تھی جس کے صدر لارڈ ہنٹر تھے۔ سر چمن لال سیتل واد۔ پنڈت جگت نرائن اور سر سلطان احمد اس کے تین ہندوستانی ممبر تھے۔ ان لوگوں نے اپنی اقلیت کا اختلافی نوٹ علیحدہ لکھا۔ مگر نوٹ پر جو توجہ ہوئی اس سے پبلک بالکل مطمئن نہیں ہوئی۔ اسی درمیان میں صلح سیورز نے ترکوں کے خلاف فیصلہ کیا جس پر مسلمان بہت برافروختہ خاطر ہوئے۔ مسٹر گاندھی نے فوراً اس موقع سے فائدہ اُٹھانا چاہا اور دو الزامات قائم کر دئے۔ (۱) گورنمنٹ کی پنجاب میں ناانصافیاں۔ (۲) ترکوں کے ساتھ بُرا برتاؤ۔ ان دونوں وجہوں کو نان کواپریشن کے وجوہات قرار دئے۔ ۱۹۱۹ء کی امرتسر کانگریس میں نئی گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے ساتھ تعاون کے مسئلے پر بہت زور و شور کے ساتھ بحث و مباحثے ہوئے۔ اس وقت مسٹر گاندھی اور مسٹر تلک دونوں تعاون کے لئے تیار تھے۔ مگر بعد میں مسٹر گاندھی نے

اپنی رائے بدل دی اور نان کواپریشن کی بڑی گرمجوشی سے تلقین کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ مسٹر تلک اس کے بہت سخت مخالف تھے۔ اگر مسٹر تلک زندہ رہے ہوتے تو حالات و واقعات ملک میں کیا رخ اختیار کئے ہوتے یہ بات اب محض قیاسات پر مبنی ہے۔ مسٹر گاندھی کا ستارہ چمکا اور مسٹر تلک نے یکم اگست ۱۹۲۰ء کو انتقال کیا۔ مسٹر تلک کے مرنے کے بعد کوئی دوسری ہستی کہاں تھی جو نان کواپریشن کی اس کی آدھی بھی مخالفت کرتی۔ نان کواپریشن کی تجویز پر غور کرنے کے لئے لالہ لاجپت رائے کی صدارت میں کانگریس کا ایک مخصوص اجلاس ستمبر ۱۹۲۰ء میں کلکتہ میں ہوا۔ شروع میں پنڈت موتی لال اس کے مخالف تھے مگر تجویز کے آتے آتے وہ اس کے بالکل حامی ہو گئے۔ اپنے خطبۂ صدارت میں لالہ لاجپت رائے نے نان کواپریشن کے خلاف رائے کا اظہار کیا تھا مگر آپ کی اختتامی تقریر صاف نہ تھی۔ پنڈت مدن موہن مالوی اور مسٹر سی۔ آر۔ داس اس کے مخالف تھے مگر اقلیت ان کے ساتھ تھی بالآخر کانگریس نے نان کواپریشن پاس کیا۔ اس کا پہلا نتیجہ کانگریسیوں کا نئے ایکٹ کے تحت میں الکشن سے بائیکاٹ تھا جو اس کے دو مہینے بعد ہوا۔ مسٹر گاندھی نان وائلنٹ نان کواپریشن کے نعرے لگاتے رہے یعنے نان کواپریشن میں کسی غضب و غصہ سے کام نہ لینا چاہئے۔ مگر جو لوگ الکشن میں کھڑے ہوئے ان کے خلاف دیگر کانگریسیوں نے بڑے غضب و غصہ کا اظہار کیا اور ان کو پریشان کرنے اور ذلیل کرنے میں بڑی گرم جوشی سے کام لیا۔ آپ کے لیڈر نے سب سے پہلے الکشن لڑنے کو صرف " غلامی ذہنیت " سے تعبیر کر کے اکتفا کی مگر ماننے والے اپنے لیڈر سے بہت آگے بڑھ گئے۔ میں اپنی ذاتی معلومات سے یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس غیر ارادی غضبنا کی یا بالارادہ غضبنا کی جو بھی کہا جائے کے پوجاریوں نے ان لوگوں کے ساتھ جو لوگ حقیقتاً غلامی ذہنیت نہیں رکھتے تھے

اور اپنی عقل و تمیز سے کام کرتے تھے اور بے سوچے سمجھے اپنے لیڈر کے پیچھے اندھی بھیڑ کی طرح نہیں چلے جاتے تھے۔ بہت بُرے اور تہذیب سے گرے ہوئے برتاؤ کئے۔ یہ اندھے کی طرح تقلید کی لکیر پیٹنے والے صرف اپنے رہنما اور لیڈر کے حکم کو وہاں نہیں مانتے جہاں ان کو بھلا بنے اور طمانیت خاطر کی ہدایت کی جائے۔ ۱۹۲۰ء کی دسمبر کی کانگریس میں مخصوص کانگریس کے نان کواپریشن کی تجویز پر صاد کیا گیا اور یہی تجویز کانگریس کا مجوزہ مسلک قرار دی گئی۔ ناگپور کانگریس میں مسٹر سی۔ آر۔ داس بھی اکثریت میں آکر شریک ہوگئے اور نان کواپریشن کے حامی بن گئے۔

لبرل (اعتدال پسند) میں یہ پہلے کہہ چکا ہوں کہ پرانے کانگریسیوں نے ۱۹۱۸ء کے مخصوص کانگریس کے اجلاس میں نہ شریک ہونا صرف وقتی طور پر طے کیا تھا مگر واقعات نے اُن کو مستقل عدم شرکت پر مجبور کر دیا۔ دسمبر ۱۹۱۸ء میں پنڈت مدن موہن مالوی کی صدارت میں کانگریس دہلی میں ہوئی اس میں مانٹیگو اسکیم کی بابت جو تجاویز تھیں دوبارہ منظور ہوئیں اور اس پالیسی سے اختلاف کرنے والوں کے خلاف ملک بھر میں وہ مورچہ بندیاں شروع ہوگئیں جن سے اتحاد کا یقین جاتا رہا۔ ذہنیتوں۔ اصول اور پالیسی کے اختلافات خلیج کو زیادہ وسیع کرتے گئے اور روز بروز اسی بنا پر دو پارٹیاں تیار ہوتی گئیں۔ مسز بسنٹ۔ مسٹر گوندرا کھوایر۔ مسٹر سری نواس شاستری اور سی، پی، راما سوامی ایر ایک سال تک اور کانگریس میں شریک رہے۔ ان کا یہ خیال کہ کانگریس میں رہ کر اُسے اصلی پالیسی پر واپس لانے میں کامیاب ہوں گے غلط ثابت ہوا آخر کار ان حضرات نے مستقل طور پر کانگریس کو خیر باد کہا کانگریس کی مجوزہ اور اصلی پالیسی نان کواپریشن بن گیا جس کی وجہ سے دو جماعتیں الگ ہو کر اپنے علیحدہ علیحدہ

راستوں پر لگ گئیں۔

لبرل پر بھاگ جانے یا چھوڑ دینے کا الزام لگا کر خوب خوب جلے آج تک کئے جا رہے ہیں۔ مگر اصلیت کچھ اور ہے۔

لبرل سے زیادہ کانگریس سے علٰحدگی کا اور خصوصاً اس ادارے سے علٰحدگی کا رنج کس کو ہو سکتا ہے جس کے بڑوں نے اسے اُس وقت اپنی ایڑی چوٹی کا پسینہ بہا کر پرورش اور پرداخت کی ہے جبکہ ان نئے جوشیلوں کا نہ کہیں نام تھا نہ نشان۔ یہ تو ابھی جمعہ جمعہ ۸ دن سے کانگریس میں آ کر شریک ہوئے ہیں اور زور پکڑ گئے ہیں۔ لبرل لوگوں کے نزدیک کانگریس اور حب وطنی مرادف الفاظ رہے ہیں۔ انھوں نے جو راستہ اختیار کیا اُس کا ان کو بیشک رنج ہے مگر یہ سب کرنے کو پبلک مفاد کے خیال نے مجبور کیا۔ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو بیشک فطرت انسانی کے بالکل برعکس تھا۔ ان کو بخوبی معلوم تھا کہ پبلک میں ان کی وہ شہرت قائم نہ رہیگی مگر ان کے ضمیر نے اس راستہ کو ملک کی ترقی کا راستہ بتایا یہ وہی راستہ ہے جس کے لئے اگلوں نے کیا کچھ تکالیف برداشت کیں۔ میں ان معدودے چند لوگوں میں سے ہوں جنھیں غور و خوض کرنے کے بعد یہ پالیسی اختیار کرنی پڑی اس لئے میں اپنی ذاتی معلومات کی بنا پر ایک ایک لفظ نہایت وثوق کے ساتھ کہنے کو تیار ہوں یلوں تو طرح طرح کے الزامات اس علٰحدگی کے لئے لبرل لوگوں پر لگائے جاتے رہے ہیں مگر زمانے کے یہ طریقے سیاست میں کام کرنے والوں پر کچھ اثر نہیں کرتے۔ سیاسیات سے دلچسپی لینے والوں اور پبلک مفاد کے کام کرنے والوں کو جو شئے سب سے زیادہ اہم اور ضروری ہے وہ کیرکٹر (Character.) ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ اس صفت کو "پورے طور پر بنائی ہوئی قوت ارادہ" کہتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ کسی ایماندار آدمی کا اپنے ضمیر کے مطابق کام کرنے کے مقابلہ میں

کسی فرد یا گروہ کا ظاہر و باطن میں فرق رکھنا۔ ایسی رائے ظاہر کرنا جو اس کی اصلی رائے نہیں ہے اور ایسے طریقوں اور پالیسی کا اختیار کرنا جو اس کی منشا، اور اس کے ضمیر کے خلاف ہو۔ انسانیت کے لئے کہیں زیادہ مخرب اخلاق اور رائے عامہ کے لئے صحیح ارتقا کے لئے کہیں زیادہ مضرت رساں اور ملک کے لئے کہیں زیادہ نقصان دہ ہے۔ اس دکھاوے اور ضمیر فروشی کو کب کوئی روا رکھے گا کہ دل میں کچھ ہے اور زبان پر کچھ اور ہے۔ میں ۲۰ برس تک کانگریس میں تھا اور ۱۷ سال سے لبرل جماعت میں شریک ہوں۔ اس ۱۷ سال کی مدت میں میں وثوق اور یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ جو کچھ بھی میں نے کیا ہے اور جو کچھ بھی میں نے کہا ہے یا جو رائے میں نے رکھی ہے یا جو رائے میں نے دی ہے وہ وہی ہے جسے میرے ضمیر نے مجھے بتایا اور اس میں سے ایک بات بھی ایسی نہ تھی کہ اگر میں کانگریس میں رہا ہوتا تو نہ کر سکتا بلکہ اگر کانگریس میں رہا ہوتا تو بالکل یہی میرا طرز و طریقہ یہی میرا مسلک رہا ہوتا اور جو کچھ میں اپنے بارے میں کہہ رہا ہوں میرے دوسرے رفیق کار لبرل اطمینان اور یقین کے ساتھ اپنے لئے بھی کہہ سکتے ہیں۔ کہنے کو تو لبرل آج کانگریسی نہیں ہیں مگر باطن میں وہ ضرور "کانگریسی" اسی مفہوم میں ہیں جس مفہوم میں وہ پہلے کانگریسی تھے اور بس یہی اُن کے لئے کافی ہے۔

اہل سیاست اور عامہ خلائق کی خدمت کرنے والوں کے لئے ہربرٹ اسپنسر نے کہا ہے کہ انھیں وہی کرنا چاہئے جسے وہ صحیح سمجھتے ہوں "اگر پبلک اسے پسند کرتی ہے بہت خوب اگر نہ پسند کرے، بہت خوب اگرچہ وہ اُتنا اچھا نہیں ہے" (یعنی پبلک مقبولیت زیادہ اچھی بات ہے) لبرل بھی آخر انسان ہیں خلائق کی تعریف اور اس کا اعتراف آپ کو بھی پسند ہے مگر عام اعتراف سے ضمیر اور ایمان برتر ہیں۔ حکمائے سیاست نے محض پبلک اعتراف کو خلائق عامہ کی سب سے بدتر کمزوری

قرار دیا ہے۔ اس سولہ برس کی مدت میں جو کچھ کانگریس یا ہمارے ملک میں ہوا ہے اس کے لئے کوئی لبرل عذر خواہ نہیں ہو سکتا اور نہ اس کے لئے اُسے اپنے اوپر کوئی اشتباہ یا کسی طرح کا تامل ہو سکتا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ کچھ لوگوں کو لبرل جماعت پر ان کے صحیح اور سچے ہونے میں شک رہا ہو مگر واقعات کو برابر دیکھ کر وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ وہ بالکل صحیح راستے پر رہے ہیں اور ان کا طرز عمل سچا رہا ہے اور حقیقت و صداقت کا ہمیشہ ہمیشہ بول بالا رہے گا۔

نان کواپریشن اور سختیاں

مسٹر ونسٹن چرچل نے آئرلینڈ کے ذکر میں لکھا ہے کہ جو اختلافات سختیوں کے گھنے بادلوں کی چھاؤں میں اُگائے جاتے ہیں مشکل سے سرسبز و شاداب ہوتے ہیں۔ ہندوستان کا جہاں تک تعلق ہے۔ اسے زمانے کا انقلاب کہئے یا گردش ایام کی ابلہ فریبی سے تعبیر کیجئے اختلافات اور سختیاں اس طرح ساتھ ساتھ ہوا کی ہیں گویا ان میں کوئی سازش رہی ہے۔

جب ۱۹۰۹ء کے ایکٹ کے تحت میں نئی کاؤنسلیں بنیں اور شورش و سختیوں کا بازار گرم ہوا تو اس کا پہلا پھل پریس ایکٹ کی صورت میں نمودار ہوا۔ منٹیگو اسکیم کے پہلے رولٹ ایکٹ۔ ستیہ گرہ کی مورچہ بندیوں اور مارشل لا نے ملک میں دھما چوکڑی مچائی۔ اس کے بعد نان کواپریشن نے آفت برپا کی۔ منٹیگو ایکٹ کی نئی کاونسلیں ۱۹۲۱ء کے شروع میں قائم ہوئیں۔ تمام ملک میں عجب بے اطمینانی پھیلی ہوئی تھی اور جو لوگ ان کاونسلوں میں منتخب کئے گئے تھے ان پر عدم اعتمادی اور ناراضگی کے پہاڑ توڑے جا رہے تھے اور جنھوں نے وزارتیں یا مجلس منتظمہ کی ممبری قبول کی تھیں ان پر ملامت، بدگمانیوں، مبہم الزامات، لغو اور لاطائل باتوں کے خاص طور پر مینہ برسائے جا رہے تھے۔ انھیں انتہائی

ناراضی اور بے اعتمادی کا نشانۂ ملامت بنایا جارہا تھا۔ نئے آئین کا تعارف ایک محبت بھرے شاہی فرمان اور قیدیوں کی عام رہائی کے حکم کے ساتھ ہوا۔ مگر مارشل لا کے مظالم نے جو ہم ہندوستانیوں کے دلوں میں گہرے زخم ڈال دئے تھے ان کے لئے یہ مہر آگینیاں کارآمد پھاہے نہ بن سکیں۔ زخم ہرے کے ہرے رہے۔ چیمبر آف پرنسس (انجمن والیانِ ملک) اور مرکزی مجلس قانون ساز کا افتتاح کرتے ہوئے ہز رائل ہائینس ڈیوک کناٹ نے پنجاب کی زیادتیوں پر افسوس ظاہر فرمایا اور سوراج کو لوائے برطانیہ کے تحت میں ڈومینن اسٹیٹس قرار دیا۔ اس کا بھی کانگریس اور کانگریسی خیالات کے لوگوں پر کچھ بھی اثر نہ ہوا۔ نان کوآپریشن کی تحریک نہایت زور و شور سے سارے ملک میں قائم رہی اور سہ رُخا بائیکاٹ جس میں کاونسلوں کا بائیکاٹ، کچہریوں کا بائیکاٹ اور اسکول و کالجوں کا بائیکاٹ شامل کیا گیا ہونے لگا۔ مے فروشی کی دوکانوں پر لوگوں کو جانے سے ہر طرح سے مجبور رکھنا۔ پنچایتوں کا قائم کرنا اور قومی مدارس کھولنے کی تحریک دھواں دھار اُٹھی اور انھیں مسائل پر کانگریس نے اپنی پوری طاقت سے کام لینا شروع کیا۔ خطابات اور اعزازات کو واپس کرنا اور حکام کی معاشرتی مجلسوں اور جلسوں میں عدم شرکت بھی طغرائے امتیاز قرار دیا گیا۔ اب کیا تھا۔ تقریروں اور تحریروں کے ذریعہ سے اہل ملک کو بھڑکانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا گیا۔ نفرت اور تنفر کھُلم کھُلا پھیلایا جانے لگا اور حکام کے حکم کی عدم تعمیل کے لئے بڑے شد و مد سے ہدایتیں شروع کر دی گئیں۔ ہندو مسلم اتحاد ہر کانگریسی کی زبان پر تھا اور علی برادران (مولانا محمد علی مرحوم اور مولانا شوکت علی مرحوم) اور مہاتما گاندھی میں پورا پورا بھائی چارہ ہو گیا۔ ہر ہندو مسلم اتحاد کے لئے دیوانہ تھا۔ ٹھیک اسی زمانے میں مالابار میں موپلا بلوہ ہوا جس میں ہندوؤں کو نقصان پہونچا۔ ہز رائل ہائینس شاہزادہ ولیعہد بہادر دولت برطانیہ

۲۲-۱۹۲۱ء کے موسم سرما میں ہندوستان آئے۔ کانگریس نے اس آمد کا بائیکاٹ طے کیا جس کے بائیکاٹ میں اس نے عملی حصہ لیا۔ جس دن کہ شاہزادہ ولیعہد بہادر جہاز سے بمبئی میں اُترے ٹھیک اُسی دن بمبئی ہی میں وہ شرمناک اور خونریز بلوہ ہوا جس کی بابت مسٹر گاندھی کو خود اقبال کرنا پڑا کہ "اس خونریزی کی بو ان کی ناک میں خود محسوس ہوتی ہے"۔ اس پر گورنمنٹ ہند نے ہر صوبہ کی گورنمنٹ کو ہدایت بھیجی کہ جس طرح سے ہو روک تھام کی جاوے۔ قانونی اختیارات اگر روکنے کے لئے کافی نہ ہوں اور اگر مزید اختیارات انتظاماً درکار ہوں گے تو گورنمنٹ ہند صوبوں کی حکومتوں کو ایسے اختیارات دینے کے لئے تیار ہے۔ کانگریس والنٹیر جماعت کو گورنمنٹ نے خلاف قانون جماعت قرار دیدیا۔ قوم نے اس کا جواب والنٹیر میں بھرتی ہو کر دینا چاہا جس پر ہزاروں کی تعداد جیل بھیج دیئے گئے ان میں سی، آر، داس اور پنڈت موتی لال نہرو ایسے لیڈر بھی جیل گئے۔ ان مقامات پر جہاں شاہزادہ ولیعہد دورہ کرنے والے تھے۔ حکام نے بلوہ نہ ہونے کے لئے طرح طرح کی پابندیاں اور سختیاں عائد کیں۔ یہ بھلا کیسے ممکن تھا کہ پبلک گرمجوشی سے شاہزادہ ولیعہد کا خیر مقدم کرتی جبکہ ہزاروں کی تعداد میں پڑھے لکھے جیل میں بھرے جارہے ہوں۔ کیا ہو رہا ہے اور کیا ہوگا کوئی کچھ نہ بتا سکتا تھا۔ اس جھگڑے کو ختم کرنے اس طوفان کو فرو کرنے اور اس آگ کو دبانے کے لئے ایک ترکیب نکالی گئی۔ وائسرائے ہند لارڈ ریڈنگ کو لوگوں نے اور خصوصاً ان کے ممبر قانون سر تیج بہادر سپرو نے ایک راونڈ ٹیبل (گول میز) کانفرنس منعقد کرنے کا مشورہ دیا جس میں گورنمنٹ اور پبلک دونوں کے نمائندے ایک جگہ بیٹھ کر گفت و شنید کے بعد مصالحت کے طریقے نکالیں۔ صرف سر تیج بہادر سپرو ہی نہیں بلکہ کانگریس کی جانب سے

پنڈت مدن موہن مالوی بھی اس کانفرنس کے انعقاد کے لئے کوشاں تھے مسٹر سی، آر، داس اور نیز اُس سال کی کانگریس کے صدر مسٹر سی۔ وجیار اگھو اچاریہ اس رائے کی متابعت کرتے تھے۔ اور ان کے علاوہ بہت سے اور کانگریسی لیڈر اسی طرح خواہشمند تھے۔ مگر مسٹر گاندھی نہ مانے اور مخالفت کی۔ نتیجہ ظاہر تھا۔ حالات روز بروز بد سے بدتر ہوتے گئے۔ اب کی بار کانگریس احمد آباد میں ہوئی جس کے صدر مسٹر سی، آر، داس منتخب ہوئے مگر چونکہ موصوف اس وقت جیل میں تھے اس لئے ان کی جگہ حکیم اجمل خاں صاحب کو جو یکساں ہندو مسلمان، لبرل اور کانگریسی سب سے خراج تحسین اور اعزاز حاصل کر چکے تھے اور جن کی بہت زیادہ عزت ہر طبقہ اور ہر ملت میں کی جاتی تھی دی گئی۔ گورنمنٹ کے تشدد کا جواب زیادہ انتہا پسندی سے دیا گیا اور کانگریس کے لائحہ عمل میں تخریبی تبدیلیاں بقول غیر کانگریسیوں کے کی گئیں۔ علاوہ اور باتوں کے ایک بات جو بہت زیادہ خلاف امید ہوئی وہ پنڈت مدن موہن مالوی کا نئے لائحہ عمل پر اپنا دستخط ثبت کرنا تھا۔ کانگریس نے سول نافرمانی (قانون کو توڑنے) کا اعلان کر دیا اور مسٹر گاندھی کو ڈکٹیٹر مقرر کر دیا۔

کانگریس کے اجلاس کے بعد حالات پہلے سے کہیں اور زیادہ خراب ہوتے گئے۔ پہلے سے زیادہ تشدد کے مظاہرے نظر آنے لگے اور چوری چورا ضلع گورکھپور میں تو اس کی کوئی حد و نہایت ہی نہیں رہی۔ قسمت گورکھپور میں کرمنل لا امنڈمنٹ ایکٹ کے تحت میں کوئی کارروائی نہیں ہوئی تھی۔ وہاں کے کمشنر نے گورنمنٹ کو لکھ بھیجا تھا کہ قسمت گورکھپور کے تینوں اضلاع میں اس قانون کے نفاذ کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہے اس لئے یہ قانون یہاں سے ہٹا لیا جائے۔ اُسے اس بات کا فخر تھا کہ اس کے ضلع میں اُسے

ایسے قانون کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی۔ اس کے ساتھ ہی آٹھ دن بعد چوری چورا کا واقعہ ہوا۔ خیال کرنے کی بات ہے کہ کمشنر کو کیا خفت ہوئی ہوگی۔ اس بلوہ میں جو شرمناک سفاکیاں ہوئیں اُن سے مہاتما جی بہت متاثر ہوئے۔ یہاں تک کہ آپ نے نان کوآپریشن کو چھوڑ کر آئینی تحریک شروع کرنے کا اعلان کر دیا۔ چوری چورا کے واقعے کے بعد نان کوآپریشن کی تحریک میں وہ زور نہیں رہا اور کانگریس میں کچھ لوگ اس خیال کے پیدا ہو گئے کہ کاونسلوں میں جا کر اندرونی نان کوآپریشن " متواتر ۔ مسلسل اور ضد کر کے " کرنا چاہیئے اور ہر طرح کی رکاوٹیں پیدا کرنی چاہیں۔ یہاں یہ ملحوظ خاطر رہے کہ اس وقت مہاتما گاندھی اور علی برادران جیل میں تھے البتہ مسٹر سی، آر، داس اور پنڈت موتی لال نہرو جیل سے واپس آچکے تھے۔ ان لوگوں کا بظاہر یہ خیال تھا کہ ان کو جیل جانے اور دیگر ایثار کا اثر گورنمنٹ پر نہیں ہوا اس لئے کوئی ایسی نئی بات کرنی چاہیئے جو گورنمنٹ کو مرعوب متاثر کر سکے۔ گورنمنٹ کی جانب سے جو سختیاں ہوئیں انکا نتیجہ بہت زیادہ اُس کے حق میں سودمند نہ ہوا تھا قبل اس کے کہ پروگرام میں کوئی تبدیلی کی جاوے آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے ایک کمیٹی " کیا سول نافرمانی کسی طور و طریقے سے یا اُسی طرح قائم رکھی جائے " معلوم کرنے کے لئے بٹھائی۔ اس کمیٹی کے صدر حکیم اجمل خاں اور دیگر ممبر مسٹر موتی لال نہرو۔ ڈاکٹر انصاری۔ مسٹر سی۔ راجہ گوپال اچاریہ۔ مسٹر وی، جی، پٹیل اور مسٹر ایس، کستوری رنگا آئنگر مقرر ہوئے۔ (رپورٹ پنڈت موتی لال نے مرتب کی)۔

سول نافرمانی کی تفتیش کمیٹی

اس کمیٹی کی رپورٹ کافی معنی خیز تھی جیسا کہ خیال ہو سکتا ہے۔ یہ رپورٹ یکطرفہ تھی مگر غیر پارٹی کے لوگ یا جنھیں سول نافرمانی کی پالیسی سے اتفاق

نہ رہا ہو۔ اس سے دوسرے نتیجے بھی نکال سکتے تھے۔ اس رپورٹ میں یہ بات تسلیم کی گئی تھی "کہ جہاں تک طلبہ کو گورنمنٹ اسکولوں، اور کالجوں سے نکال لینے کا تعلق ہے ہمیں اس میں کافی کامیابی نہیں ہوئی ہے" اور طلبہ کا بیشتر حصّہ جو ہمارے ساتھ آگیا تھا رفتہ رفتہ اپنے پُرانے مدرسوں میں واپس چلا گیا ہے" اس سے صاف ظاہر ہے کہ رپورٹ کے آخری حصّے میں جو دعویٰ کیا گیا تھا کہ "نان کواپریشن تحریک نے گورنمنٹ کے مدارس کی شہرت کو برباد کردیا ہے" بالکل غلط تھا۔

ناکامیابی کا اعتراف

"بدقسمتی سے قومی مدارس نہیں کافی ہیں" اس کا اعتراف کیا گیا مگر ساتھ ہی ساتھ "جو مدارس قائم ہوسکے وہ بھی اطمینان بخش نہیں کہے جاسکتے" "بیشتر ان میں گورنمنٹ مدارس کی طرح کے انصاب ہیں۔ البتہ چرخہ۔ کرگہ اور ہندی کی جبریہ تعلیم" اس نصاب کے علاوہ ہے" تقریباً کل کے کل مدارس جہاں ہم گئے مالی مصیبت میں پھنسے ہیں"، کمیٹی نے "عملی پروپیگنڈہ کو روکنے کی سفارش کرتے ہوئے اسکول اور کالج کے طلبہ کو مدعو کیا"، مگر سنہ ۱۹۳۰ء کے سول نافرمانی کے موقعے پر اسی طرح پروپیگنڈہ شروع کیا گیا جس میں پکٹنگ بھی ہوئی اور اس میں غضب و غصہ سے بھی کام لیا گیا۔ ابکی بار نوجوانوں کو یہ تحریک کھینچ نہ سکی اور کانگریسی کام رہے۔ کوئی شخص جو رپورٹ کو پڑھے گا اور خصوصاً ایسی رپورٹ جو اس قدر تجربہ کار لوگوں نے لکھی ہے تو اُسے ان لوگوں کی اس تعریف پر جو نوجوانوں کی گیس ہیں اور ان کے جوش وخروش کی ثنا اور صفت پر بیشک ہنسی آئے گی۔ خیر بعد میں سمجھ آئی اور اس غلطی کو سنہ ۱۹۳۲ء کی تحریک سول نافرمانی کے موقعے پر نہیں دُہرایا گیا۔ عدالتوں کے بائیکاٹ کے متعلق رپورٹ میں تحریر ہے۔

"ہمیں اس کا اقرار ہے کہ طلبہ کے معاملے کی طرح اس میں بھی ناکامی ہوئی"، جو لوگ وکالت چھوڑ کر آئے ہیں اُن کی تعداد بمقابلہ ان لوگوں کے جو اپنا کام کرتے رہے ہیں بہت کم ہے اور جو لوگ کہ چھوڑ کر آئے" ان کی تعداد بھی اور کم ہوگئی اس لئے کہ ان میں سے بہت سے اپنے ذاتی یا دیگر مصالح کی بنا پر جا کر دوبارہ وکالتیں کرنے لگے ہیں" کمیٹی نے وکیلوں کی بابت جو وکالت کی ہے اس سے معاملہ بالکل صاف ہو جاتا ہے۔ سرکاری عدالتوں کی جگہ پنچایتیں اسی طرح بنائی جانے والی تھیں جیسے کہ سرکاری مدرسوں کی جگہ قومی مدارس۔ اس کے بعد رپورٹ میں تیسری ناکامی کا اقرار، و اعتراف یوں کیا گیا ہے" بلاشبہ ہماری کوشش کہ سرکاری عدالتوں کی جگہ کوئی مناسب ادارہ لے لے ناکام رہی"۔

ان پنچایتوں نے کیا نت نئے مظالم کئے۔ واقفکار نظریں انھیں دیکھ چکی ہیں اور اب تک وہ حافظے میں محفوظ ہیں۔ دوسرا اقرار کھدر کی بابت ہے۔ کمیٹی نے کہا ہے" حقیقت تو یہ ہے کہ یقین کے ساتھ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کون ٹکڑا کھدر کا شدھ کھدر ہے" اور" ملک میں جو بہت سے کھدر بھنڈار ہیں ان کی بابت یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ ان میں سے کون اصلی کھدر فروخت کرتے ہیں"۔ آگے چل کر رپورٹ میں لکھا ہے" کسی ضلع یا تحصیل کی بابت یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہاں کی زیادہ آبادی سودیشی تحریک پر عمل پیرا ہے یا ہاتھ کے بُنے ہوئے اور کتے ہوئے سوت کا کپڑا پہنتی ہے اور نان کواپریشن کے دیگر اصولوں پر پابند ہے" مسکرات کی دوکانوں پر جو پکٹنگ ہوئی وہ تو اپنے ساتھ ساتھ بعض مقامات پر جھگڑا اور لڑائیاں کرا گئی۔ کیا کانگریس کے نقطۂ نگاہ سے یہ کامیابی کہی جا سکتی ہے۔ جواب خود کمیٹی دے رہی ہے" پہلے تو مے نوشی کی دوکانوں کی بکری بہت کم ہو چلی تھی مگر پکٹنگ کے ہٹاتے ہی پہلی حالت پھر ہو گئی" اس ضمن میں یہ بھی

کہنا ضرور ہے کہ گورنمنٹ نے دفعہ ۱۴۴ ضابطہ فوجداری کا مصرف ضرورت سے بہت زیادہ کیا اور بعض جگہوں پر تو اس کا مصرف ایسے وقت پر کیا گیا جس کے لئے یہ دفعہ کبھی بنائی نہیں گئی تھی۔ اسی کے ساتھ کمیٹی کی رائے بھی نقل کی جاتی ہے "ہر حالت میں دفعہ ۱۴۴ ضابطہ فوجداری کے مصرف کے احکام غلط نہیں کہے جا سکتے۔ اگر ایسا ہے تو جس غرض و غایت سے یہ دفعہ بنائی گئی ہے اس کا مطلب ہی فوت ہوا جاتا ہے۔"

کاونسلوں کا بائیکاٹ

ناظرین کو یاد ہوگا کہ کاونسلوں کے بائیکاٹ کو کانگریس پروگرام میں ایک خاص اہمیت حاصل تھی اور ۱۹۲۰ء میں کانگریس کے کارپردازوں نے اس کو کس قدر ضروری اور اہم شے بنا رکھا تھا۔ عدالتوں کی طرح کاونسلیں بھی "نجس، ناپاک" غلیظ بتائی جاتی تھیں اور کہا جاتا تھا کہ ان سے مس ہونے میں نجاست سرایت کرجاتی ہے۔ کمیٹی مذکورۂ بالا کو اسکی بابت خاصکر غور کرنے اور قرار داد دینے کا فرض سپرد کیا گیا تھا۔ اس کے ممبروں میں آدھے آدھے کا اختلاف ہوا یعنے ڈاکٹر انصاری (سال گذشتہ سے انھوں نے اپنی رائے بدل دی ہے) اور مسٹر کستوری رنگا آئنگر اور مسٹر راجہ گوپال اچاریہ بائیکاٹ کے موافق تھے اور حکیم اجمل خاں، پنڈت موتی لال نہرو اور مسٹر وی، جی پٹیل کی رائے اس کے برعکس تھی۔ مسٹر پٹیل وغیرہ نے کہا کہ بائیکاٹ کا مفہوم اور مقصد مہاتما گاندھی کے نزدیک یہ تھا کہ "ووٹر ووٹ دینے سے قطعی طور پر رکیں اور وہ کاونسلوں کو خالی رکھنا چاہتے تھے۔"

یہ بھی یاد رکھنے کی بات ہے کہ کاونسلوں کا بائیکاٹ صرف مہاتما گاندھی کے اثر سے طے ہوا تھا اس لئے کہ انھوں نے "۱۲ مہینے کے اندر سوراج

حاصل کر لینے کا وعدہ کیا تھا" تین ممبروں نے جو کاونسلوں میں جانے کے موئد تھے اس طرح تحریر کیا ہے" زمانہ بدل گیا۔ واقعات تبدیل ہو گئے۔ حالتیں دوسری ہیں۔ وقت دوسرا آ گیا ہے۔ جدوجہد کا زمانہ غیر محدود زمانے تک بڑھا دیا گیا ہے" اس کے بعد یہی لوگ لکھتے ہیں" ہر سال ایسے طریقے ایجاد کئے جاتے ہیں جو لوگوں کی زندگیوں سے متعلق ہوتے ہیں۔ نئے نئے ٹیکس اور بڑی بڑی ذمہ داریاں عائد کی جا رہی ہیں اور اسی طرح لوگوں کے نمائندوں کی جانب سے برابر عائد کی جائیں گی اور لوگ خاموشی سے چپ چاپ اسی طرح انھیں قبول کرتے جائیں گے۔ ان حالات کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ امر قابل غور ہے کہ عوام کے خیالات کانگریس کی جانب سے کہاں تک وہی رہیں گے اور کہاں تک کانگریس کا اثر عوام پر قائم رہ سکتا ہے۔

فرض کیجئے کہ کانگریس اسی طرح کاونسلوں کے بائیکاٹ پر کمر بستہ رہے اور اگر کہیں ووٹروں کی زیادہ تعداد نے (الکشن میں حصہ لے کر) اپنے ووٹ دیدئے تو اس صورت میں ہماری ناموری کو ضرور ٹھیس لگے گی۔ ہمیں یقین ہے کہ کاونسلوں کے بائیکاٹ کی تحریک اب عوام میں پسندیدہ نظروں سے نہیں دیکھی جا رہی ہے اور اس کا زیادہ احتمال ہے کہ ووٹروں کی بڑی تعداد آئندہ الکشن میں حصہ لے۔ اس صورت میں الکشن کی کامیابی ایک گذری ہوئی بات ہو جائے گی (ہم پھر کچھ نہ کر سکیں گے) اور پھر پوری تحریک پر اس کا اُلٹا اثر بھی ہوگا"۔

ذیل کے فصیح الفاظ میں نتیجہ اس طرح نکالا گیا ہے:۔

"قبل اس کے کہ تم (ہم لوگ) ہندوستان کی اس بڑی آبادی کے لاکھویں حصے کو ہاتھ کے کتے ہوئے اور ہاتھ کے

بنے ہوئے کھدر پہنا سکو قبل اس کے کہ تم قومی مدارس کی اشد ضرورت کا ایک دسواں حصہ تیار کر سکو۔ قبل اس کے کہ قابل لحاظ ترقی چھوت چھات کے توڑنے میں کی جائے۔ قبل اس کے کہ تم اس مرد و دگروہ سے علیحدگی حاصل کر سکو جو تمھاری بین الملل اتحاد کی کوشش کے راستہ میں روڑے اٹکا رہا ہے۔ ہم تمھیں متنبہ کئے دیتے ہیں کہ تم کہیں کے نہ رہ جاؤ گے تاوقتیکہ تم وقت موجودہ کی ضرورت کا لحاظ نہ کرو۔ نظریے اور اقوال اپنے اپنے مقام پر ٹھیک ہیں مگر ان سے کوئی قابل فخر کامیابی نہیں ہو سکتی ہے چاہے ان کے پیچھے جان تک کیوں نہ دے دی جائے۔ ان کاونسلوں کا سرکچل دو غیر ممالک میں پروپگنڈہ کرنے سے اور اس پر لاکھوں روپئے صرف کرنے سے یہ کام کہیں زیادہ مؤثر و مفید ہے۔ ان اصلاحات کو توڑ ڈالو۔ تمھارے محض ایک وار سے وہ طلسم جس پر لاکھوں صرف ہوئے ہیں ٹوٹ جائے گا۔"

آخر میں کاونسل کے داخلے کے محرکین نے یہ بتا کر داخلے پر زور دیا کہ داخلہ "سول نافرمانی کی طرح ایک عملی اور کرنے کے قابل طریقہ ہے۔" ذرا غور تو فرمایئے کہ "سول نافرمانی کی طرح کا" کیا جملہ ہے اور اس کے کیا معنی اور مطلب ہیں۔ اسے اگر ابلہ فریبی کہا جائے تو ہرگز غلط نہیں ہے۔

یہ تین حضرات کو یقین کامل تھا کہ اگر یہ تینوں کاونسلوں میں پہونچ گئے تو "کاونسلیں ضرور ٹوٹ جائیں گی" اور "اصلاحات کا خاتمہ ہی ہو جائے گا" یہ بتایا گیا کہ چونکہ ہماری خواہش کے مطابق کاونسلیں درست نہیں کی گئی ہیں اسلئے ہم ان میں داخل ہو کر انھیں ختم ہی کر دیں گے۔ کیا خام خیالی تھی۔ گویا کہ

ختم کردینا بچوں کا کھیل تھا۔ رپورٹ کا پیرا ۱۰۹ بہت کافی لطف کا ہے۔ اس کی سُرخی "سرسری تبدیلیاں" ہے۔ اس ٹکڑے میں ۱۹۱۹ء سے لے کر ۱۹۲۲ء تک جو کانگریس کے لائحہ عمل میں تبدیلیاں ہوا کی ہیں اُنکا بالترتیب اور تاریخ وار ذکر ہے۔ دوسرے تین اور ممبر جو کاونسل کے بائیکاٹ کے موافق تھے لکھتے ہیں "کاونسلوں کی جگھوں کی ذات۔پات۔مذہب وملت کی بنا بر تفریق سے یہ غیر ممکن ہے کہ اس میں اپنی اکثریت حاصل کرکے جیسی شورش اور رُکاوٹ ہم چاہتے ہیں اُس میں پیدا کرسکیں" اس کے بعد وہی لوگ پھر لکھتے ہیں "جب ۱۹۲۰ء میں یہ تجویز پیش ہوئی تو مہاتما گاندھی نے اسے اس وجہ سے مسترد اور نامنظور کیا کہ یہ سچائی اور ایمانداری کے بالکل خلاف ہے کہ کسی ادارے میں اُس کے توڑنے کی نیت اور غرض سے داخل ہوا جائے۔ علاوہ بریں ہر ممبر کو وفاداری کی قسم لینی پڑتی ہے جس میں اس بات کا وعدہ ہوتا ہے کہ ان فرائض کو جن کے لئے یہاں آیا گیا ہے ایمانداری سے انجام دیا جائے گا۔کسی ایماندار آدمی کو الکشن میں اس غرض سے نہیں کھڑا ہونا چاہئے کہ وہاں جاکر وہ اس ادارے کو توڑے گا اور حلف وفاداری اُٹھائیگا اگر یہ ایمان فروشی اور ضمیر فروشی کسی حالت میں مانی جاسکتی ہے تو وہ صرف فوری ضروریات کی بنا پر قابل قبول ہوسکتی ہے۔ ہر طرح کی رُکاوٹ پیدا کرنا حلف کے صریحی خلاف ہے اور جو نان کواپریشن کے بنیادی اصولوں کے ماننے والے ہیں ان کا ضمیر اس پر ملامت کرے گا۔

جن لوگوں نے اس پورے پروگرام پر غور وخوض کرنے کے بعد اس کو غلط ٹھہرایا تھا ان کے نزدیک یہ تبدیلیاں بھی اتنی ہی مضحک اور ساتھ ساتھ افسوسناک ہیں۔ سر رشتے بائیکاٹ کو ختم کرنے کے بعد آپس کے جھگڑے

سوراجیوں (جو لوگ کاونسل بائیکاٹ کے خلاف تھے) اور عدم تبدیلی والوں (یعنی جو بائیکاٹ کے موافق تھے) کے درمیان شروع ہوگئے۔ مہاتما گاندھی کے دونوں لفٹننٹ پنڈت موتی لال نہرو اور مسٹر سی، آر، داس اس جنگ وجدل میں کاونسل میں جانے کے مؤید تھے اور جو لوگ اس کے خلاف تھے ان کے گروہ میں اِن لوگوں کی شخصیت کا کوئی لیڈر نہ تھا اس وقت خود مہاتما گاندھی جیل میں تھے الکشن میں کھڑے ہونے کی منظوری حاصل کرنے کی غرض سے کانگریس کا ایک مخصوص اجلاس خزان ۱۹۲۳ء میں دہلی میں منعقد کیا گیا۔ منظوری حاصل ہوئی اور ابکی الکشن میں کانگریسی امیدواروں کو بیشتر صوبوں میں بہت کامیابی ہوئی۔ مہاتما جی کے جیل سے آنے کے بعد دونوں جماعتوں میں قوت آزمائیوں کا ایک بازار گرم ہوا جس میں سوراجی کامیاب نکلے اور اس کے بعد مہاتما جی بھی اُن کی مدد کے لئے آمادہ ہوگئے۔

سوراجی کاونسلوں میں

الکشن میں شاندار کامیابیوں کے باوجود سوراجیوں کو کسی ایک کاونسل میں اکثریت حاصل نہ ہوئی۔ پھر بھی ترکیب ضرورت کا لحاظ کرکے انھوں نے دوسری پارٹی سے اتحاد قائم کرلیا اور بنگال و ممالک متحدہ اور ممالک متوسط میں وزارتوں کا خاتمہ کردیا۔ دوسری کاونسلوں میں بھی وطن پرستوں کی دوسری جماعتوں سے میل جول قائم رکھا گیا۔ اس طرح مختلف پارٹیوں کے ساتھ مل کر کام کرنے سے یہ بات ضرور ثابت ہوگئی کہ اختلاف سے زیادہ اتحاد ممکن ہے اور سول نافرمانی کمیٹی نے بھی یہی رائے ظاہر کی تھی چنانچہ اس کے الفاظ یہ ہیں" اصولی اختلافات کے بابت (جو ہندوستان میں مختلف پارٹیوں کے درمیان قائم ہیں) اب تک بہت کچھ کیا جاسکتا ہے مگر یہی اصول طریقوں سے متعلق ہیں اور خاص

امور سے بے تعلق ہیں .... ایسے اختلافات سے قطع نظر کرتے ہوئے .... ہمارا خیال ہے کہ پھر بھی بہت سے اچھے کام ایسے باقی رہ جاتے ہیں جنھیں مختلف پارٹیاں بغیر اپنے اصولوں کا خون کئے ہوئے بخوبی انجام دے سکتی ہیں۔ ہمیں بخوبی یاد ہے کہ ہم نے کاونسل کے ممبروں اور اہل تعاون کی بابت عام طور پر چند واقعات کا ذکر کیا ہے مگر پھر بھی اس سے ہمارا مقصد یہ ہرگز نہیں ہے کہ سب کاونسل کے ممبر اور تعاون کرنے والے ایک ہی طرح کے ہیں۔ ان میں سے بہت سے ایسے بھی ہیں جنھوں نے تعاون کا راستہ اختیار کر کے صحیح طور پر کام کئے ہیں .... ہم اس کے اظہار کی جسارت کرتے ہیں کہ اختلافات کو اپنی اپنی جگہ پر رکھتے ہوئے بھی ایک عام مسلک ایسا ممکن ہے جس پر دونوں پارٹیاں مل کر صحیح کام کرسکتی ہیں۔ معمولی ابتدا کے ذریعے سے بھی اچھے نتیجہ پر پہونچا جا سکتا ہے .... نان کوآپریٹر کا (ترک موالاتی) سب سے اہم فرض اپنے اہل وطن کے ساتھ تعاون ہے اس لئے ہمیں توقع ہے کہ مستقبل قریب میں ان اشاروں سے کافی فائدہ اٹھایا جاسکے گا"!

کانگریس کا غیر کانگریسیوں کے ساتھ رویہ یا برتاؤ

بڑے افسوس کا مقام ہے کہ اس فرض عامہ کے کھلے ہوئے اصولوں کو الکشن کے موقع پر کانگریسیوں نے بالکل بھلا دیا۔ باوجودیکہ کانگریسی ایم، ایل، اے اور ایم، ایل، سی حضرات کو اس بات کا بخوبی تجربہ ہو چکا تھا کہ دوسرے محبان وطن کے ساتھ تعاون کرکے انھیں بہت کافی قوت پہونچ چکی تھی اور اگر ان دیگر محبان وطن نے ان کا ساتھ نہ دیا ہوتا تو کانگریسی شاید ہی کوئی معقول کام انجام دے سکتے پھر بھی اندھیر تو یہ تھا کہ کانگریسیوں نے بلا لحاظ قابلیت، اور بلا لحاظ گذشتہ خدمات یا طرز عمل

ہر دوسرے محبان وطن کے خلاف جو کانگریس کے اصطلاحی معنوں میں ممبر نہ تھے جہاد بول دیا اور ہر طرح کی بے عنوانیاں ان کے خلاف کانگریس کی جانب سے ہوئیں۔ ہمیں زیادہ کہنے کی چنداں ضرورت نہیں ابھی سال گذشتہ کے تجربات خود شاہد ہیں کہ کانگریس کا طرز عمل کس قدر غلط۔ خلاف اخلاق اور گرا ہوا رہا ہے۔ ایک بار اسی طرح کے تعاون کا تجربہ ولایت کے دارالعوام میں بھی کیا گیا تھا یعنی اپنی اپنی جگہوں پر دونوں پارٹیوں کے امیدوار خوب لڑے مگر دارالعوام کے اندر آکر تعاون قائم کیا گیا (دیکھو ۱۹۲۴ء میں اس تعاون کے حالات جو لیبر و لبرل پارٹی کے درمیان ولایت میں قائم ہوا) اس تعاون کو بالکل ہی کامیابی نہیں ہوئی۔ میں اس بات کو کہنے پر مجبور ہوں کہ چند کو چھوڑ کر کانگریسی اپنی ہستی کو انسانی ہستی سے بلند و بالا خیال کرنے لگے ہیں۔ (غالباً جامہ انسانیت سے خارج ہو گئے ہیں!) اور جو لوگ کانگریس کے رت نئے روپ بدلنے والے اصولوں، منگھڑت اقوال اور فتاوے پر ایمان نہیں لاتے ان کے ساتھ نفرت انگیز عدم رواداری کے برتاؤ کرنا اُن کا فرض اولین ہو گیا ہے۔ یہی نہیں شاید ہی کوئی ایسی مثال ہو جہاں ملک کے خیال کو پارٹی کے خیال کے مقابلے میں ان لوگوں نے فوقیت دی ہو اور اُسے مقدم سمجھا ہو۔

پارلیامنٹری (جمہوری) اصولوں کی دُرگت

کانگریس کے ٹکٹ پر کاؤنسلوں کے لئے کھڑے ہونے والے اُمیدواروں سے قسم لی گئی کہ وہ ہمیشہ جو بھی کانگریس کے احکام ہوں گے ان پر بلا چون وچرا متبع اور پابند ہوں گے۔ پارلیامنٹری یعنے جمہوری اصولوں کے اصلی بنیادی اصول یہ ہیں کہ منتخب شدہ ممبر صرف

اپنے اپنے حلقۂ انتخاب کا ذمہ دار ہے وہ کسی ایسی حکومت یا ادارے کا جو مجلس قانون ساز کے باہر ہو اور جس کا تعلق اُس کے حلقۂ انتخاب سے نہ ہو۔ ہرگز ذمہ دار نہیں ہے۔ اسی کو مسٹر جے۔ اے۔ اسپنڈر نے "پابند بنانے والے آزادی ضبط کرنے والے اور جمہوری اصولوں سے بغاوت کرنے والے اصول" کہا ہے۔ لیبر پارٹی نے ولایت میں ۱۹۲۴ء میں جب پہلی بار حکومت لیبر پارٹی کے ہاتھوں میں آئی یہی کیا۔ اس بات پر لیبر پارٹی گورنمنٹ کو زبردستی عمل کرانے میں کسی قدر کامیاب ضرور ہوئی۔ گورنمنٹ (لیبر گورنمنٹ) کو آخرش یہ دن دیکھنا پڑا کہ حکومت اختیار کرنے کے دس مہینے کے اندر ہی شکست ہوئی اور لیبر پارٹی کی گورنمنٹ بہت دنوں کے لئے رخصت ہوگئی۔

چلتی پھرتی ہوئی حب الوطنی

جیسا کہ پہلے سے معلوم تھا کاونسل کے کانگریسی ممبران کاونسلوں کو "پاش پاش کرنے" اور خاتمہ کر دینے میں ناکام ہوئے اس کے بعد ان لوگوں نے دوسری بہادری کا ایک اور مظاہرہ کیا یعنے مارچ ۱۹۲۶ء میں کاونسلوں سے سب کے سب نکل آئے۔ مگر ہر ایک کاونسل میں انھیں ممبروں کی دوبارہ جانے کے لئے اجازتوں کی درخواستیں خاص معاملہ کی اہمیت جتا کر آنی شروع ہوگئیں کانگریس کی مجلس منتظمہ نے خیال کیا کہ کہیں اس کے ممبروں پر جو اثر ہے وہ جاتا رہے اور وہ ہاتھ سے نہ نکل جائیں دوبارہ جانے کی درخواستیں منظور کر لیں۔

مارچ ۱۹۲۶ء کے زمانے میں اور کاونسلوں اور اسمبلی کے ختم ہونے کے دوران میں کانگریسی کاونسل کے ممبروں نے اندر آنے اور نکل جانے کا ایک پُرلطف مظاہرہ پیدا کر رکھا تھا جس کی وجہ اور ضرورت صرف کچھ وہی

لوگ بتا سکتے تھے۔ ممالک متحدہ کے ایک وزیر مالیات نے انھیں اس حرکت کی بنا پر چلتے پھرتے محبان وطن کا لقب دیا تھا اور سر تیج بہادر سپرو نے ان کے اس آؤ جاؤ کو حب الوطنی کی دھما چوکڑی یا متحرک حب الوطنی کہا تھا۔

۱۹۲۶ء میں یہ لوگ دوبارہ الکشن کے لئے کھڑے ہوئے۔ ابکی بار بعض کو معلوم ہوا کہ قلعی کھل گئی ہے اور ووٹ دینے والے اس آؤ جاؤ کی پالیسی سے گھبرا گئے ہیں اور اب انھیں یہ بھی یقین نہیں رہا ہے کہ آیا وہ کانگریسی امیدوار اپنی جگہوں پر جم کر اپنے فرائض کو انجام بھی دیں گے یا نہیں اور یہ بھی صاف ظاہر ہو گیا کہ کاونسلیں نہ تو پاش پاش ہوئیں اور نہ ان کا خاتمہ ہی ہوا بلکہ اس کے خلاف وہ اور ترقی کر رہی ہیں البتہ کانگریسی امیدواروں میں پھر منتخب ہو جانے کی پوری لاگ ڈانٹ تھی اور اچھی خاصی چہل پہل پیدا ہو گئی تھی۔ کانگریس کو ۱۹۲۳ء کے الکشن میں کامیابی ہوئی تھی مگر اس کے راستے میں ابکی بار ایک اور روڑا تھا۔ ہندو ووٹ دینے والے کانگریس سے کچھ بدظن تھے خیال یہ تھا کہ جہاں ہندو حقوق کا تصادم مسلمانوں کے حقوق سے ہوتا ہے کانگریس ایسے موقع پر ہندو حقوق کا تحفظ پوری طرح سے کرنے سے قاصر ہے جس کی مثال سی۔ آر۔ داس کا وہ پیکٹ (میثاق) تھا جو دسمبر ۱۹۲۳ء میں مسٹر داس نے مسلمانان بنگال سے کیا تھا۔ بنگال کے ہندوؤں نے خاص طور پر اور ہندوستان بھر کے ہندوؤں نے عام طور پر اسے نامنظور کر دیا تھا جس میں اکثر کانگریسی ہندو بھی شامل تھے۔ اسی وجہ سے ہندو مہا سبھا نے بھی الکشن پر کمر باندھی اور پنڈت مدن موہن مالوی اور لالہ لاجپت رائے کی رہنمائی میں زبردست کامیابیاں حاصل کیں گذشتہ کاونسل کے مقابلہ میں ابکی بار کی کاونسل میں کانگریسی ممبروں کی تعداد کم تھی۔ یہ ضرور ہے کہ ابکی بار

بھی کانگریسی ممبران ۔ لبرل اور دیگر محب وطن جماعتوں کے ممبروں میں تقریباً کلی تعاون واتحاد تھا ۔ اس تعاون کو الکشن کے وقت خیرباد کہہ دیا جاتا تھا۔ ان کاونسلوں کی میعاد ختم نہ ہونے پائی تھی کہ کانگریسی ممبران پر احکام جاری ہوگئے اور ان سے استعفے داخل کرادئے گئے ۔ گذشتہ اسمبلی میں کانگریسی پھر داخل ہوئے ہیں اور صوبہ کی کاونسلوں میں آیندہ الکشن میں کانگریسی پھر جائیں گے ۔

کاونسلوں کے بائیکاٹ کی پالیسی کی ایک حیرت انگیز شرح ذرا مہاتما گاندھی جیسے بزرگ کی زبان اقدس سے ملاحظہ ہو اور جسے آپ نے چند ماہ گزرے ہیں فرمایا ہے کہ جمہوری ذہنیت کانگریسیوں میں فنا ہورہی ہے اسلئے کاونسلوں میں جانے کی تحریک کی تائید کے لئے وہ خود ہمہ تن تیار ہیں اگرچہ یہ ظاہر ہے کہ اُن کے سختی سے ماننے والے اب بھی اس کے لئے تیار نہیں ہورہے ہیں ۔

اکالی تحریک

۱۹۲۱ء سے ۱۹۲۴ء تک پنجاب میں اس سکھ تحریک نے بہت شورش برپا کر رکھی تھی ۔ سکھوں کے ایک فرقہ اکالی نے اس کے دوسرے فرقہ اُدیسی کے خلاف یہ شورش کر رکھی تھی جس میں وہی طور و طریقے جو کانگریس نے ستیہ گرہ میں برتتے تھے اختیار کئے گئے اور گورنمنٹ نے اپنے پُرانے ہتھیار "سختیوں" سے اس کا مقابلہ کیا اکالیوں نے قانون شکنیاں کیں اور گورنمنٹ نے بھی اس قدر جبر و تشدد سے کام لیا جس کی چنداں ضرورت نہ تھی ۔ سر ایڈورڈ مکلاگن کے زمانے میں اس روش نے بہت زور دکھایا مگر ایک بیدار مغز و مدبر (سر مالکم ہیلی) نے اس جگہ پر ۱۹۲۴ء میں بیٹھ کر اس معاملہ کو صلح مصالحت سے طے کرا دیا ۔ کانگریس اور کانگریسیوں نے اکالیوں کا ساتھ اس وجہ سے دیا کہ انھوں نے گورنمنٹ سے مخالفت پر کمر باندھی تھی ۔ یہ امر بھی

قابل غور ہے کہ جب کبھی کوئی ایسی تحریک یا شورش ملک بھر میں ہوئی ہے جو گورنمنٹ یا سرمایہ داروں یا زمینداروں کے خلاف رہی ہو تو کانگریس ضرور اس کی معاون اور مددگار رہی ہے۔ کانگریس کے متعلق اگر اس جگہ یہ کہا جائے تو خالی از لطف نہ ہوگا "من برائے فصل کردن آمدم نے برائے وصل کردن آمدم"۔

سول نافرمانی منظم طریقے پر سول نافرمانی کی مورچہ بندیاں ۱۹۳۰ء اور ۱۹۳۲ء میں ہوئیں۔ نتیجہ کے بیان کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ اس سیاسی طرز کے سب سے بڑے اور بزرگ مربی نے سال گذشتہ میں عام اعلان کیا تھا کہ تمام ملک میں ان کے سوا کوئی دوسرا شخص نہیں ہے جو سول نافرمانی کر سکتا ہو۔ کیا اچھا ہوتا اگر ہزاروں آدمیوں کو جیل بھجوانے اور ملک میں عظیم الشان بے عنوانی اور بے اطمینانی پھیلانے کے پہلے ہی یہ ایجاد ہاتھ لگی ہوتی۔ اسی طرح ستیہ گرہ مقاومت مجہول، عام سول نافرمانی، نان کواپریشن (ترک موالات) سہ رُخی بائیکاٹ سبھوں کا اب یہ نتیجہ نکلا ہے کہ آج کانگریسی حضرات کاونسلوں میں زیادہ سے زیادہ تعداد میں منتخب ہو سکے ہیں۔ غالب ؎

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

اب بخوبی پتہ چلے گا کہ کانگریسی اور "مردود خلائق" لبرل میں فرق صرف اس قدر ہے کہ لبرل اس نتیجہ پر بہت پہلے پہونچ چکے تھے جو کانگریسیوں کو متواتر تلخ تجربات کے بعد ہاتھ آیا ہے۔ "برایں عقل و دانش بباید گریست"۔ لارڈ روز بری نے تدبر کی تعریف کرتے ہوئے اسے "عام سوجھ بوجھ اور دور اندیشی بتایا ہے"۔ میں اس تعریف کی بابت ہندی سیاسی پارٹیوں پر

چھپاں نہیں کرنا چاہتا۔ ناظرین خود فیصلہ کرلیں۔

کانگریسی اور عہدے

کانگریسی اس وقت اس مشکل سوال پر خاص طور پر غور کر رہے ہیں کہ آیا ان صوبوں میں جہاں کہیں ان کو انتخاب میں اکثریت حاصل ہوگی اور وہ گورنمنٹ کی عنان اپنے ہاتھوں میں لینے کے لئے مدعو کئے جائینگے تو کیا انھیں عہدے قبول کرنے چاہئیں یا نہیں۔ میری مستقل رائے ہے کہ فیصلہ عہدوں کے قبول کرنے کی بابت ہوگا۔ (آخرش یہی ہوا) کاونسلوں کے توڑنے کا خیال محض ایک خیالی پلاؤ ثابت ہوچکا ہے۔ کاونسلوں کی تشکیل کچھ ایسے نہج اور طریقے پر ہوئی ہے کہ توڑنے کا خیال صرف خام خیالی ہے۔ کوئی فرد یا کوئی پارٹی محض اس قدر کرسکتی ہے کہ عہدے قبول کرکے یا اختلافی پارٹی میں رہ کر ایسے کام کرے جن سے اہل وطن کو زیادہ سے زیادہ فائدے پہونچیں اور ساتھ ہی ساتھ ایسے کام بھی ہوں جو موجودہ نظام میں جو ہمارے سر تھوپا گیا ہے خاطر خواہ تبدیلیاں پیدا کرسکیں تاکہ سوراج کے حصول میں جلدی ہوسکے۔

سنہ ۱۹۲۲ء میں گورنمنٹ ہند اور مرکزی مجلس قانون ساز نے چند اچھے اچھے کام کئے ہیں۔ اسی سال پریس ایکٹ سنہ ۱۹۱۰ء منسوخ ہوا اور اس کے علاوہ اور چند دیگر تشددی قوانین بھی منسوخ ہوے جس کے لئے ہم خاص طور پر سر تیج بہادر سپرو کے ممنون ہیں۔ آپ اس کمیٹی کے صدر تھے جس کی سفارش پر یہ منسوخیاں عمل میں آئیں۔

قانون محافظت والیان ملک

اسے ملک کی بدقسمتی کہئے کہ قانون مطابع کی منسوخی کے بعد ہی قانون محافظت والیان ملک پاس کیا گیا۔ اس کے علاوہ ایک اور قانون

ان کی "محافظت" کے لئے بنایا گیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ "محافظت" یا "بچاؤ" کا ہے سے اور کس سے ہے۔ ہمارے ملک میں جو ریاستیں ہیں ان میں سے بیشتر ایسے ہیں جہاں کے باشندوں کو معمولی سے معمولی سیاسی حقوق بھی حاصل نہیں ہیں۔ انھیں عام جلسے کرنے کا اختیار حاصل نہیں ہے نہ وہاں آزاد مطبعے ہیں نہ وہاں نمائندگی کے ادارے ہیں اور نہ خود مختار اور آزاد عدالتیں ہیں۔

باشندگان ریاست کی جو کانفرنس ہے وہ کسی ریاست میں منعقد نہیں ہوتی بلکہ مجبوراً برطانوی ہند میں ہوتی ہے۔ عام طور پر ان والیان ریاست کی ذہنیت میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوا ہے بلکہ وہ اب تک اپنی پوری قوت اپنے پورے اختیارات کو مثل سابق کے قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ گورنمنٹ ہند کو چاہئے تھا کہ ان والیان ملک کو ان کی رعایا کو حقوق دینے اور ان کے ساتھ عدل وانصاف سے پیش آنے کی ترغیب دیتی مگر اُس نے تو اس کے برخلاف دوسرا ہی رویہ اختیار کیا ہے اور برطانوی ہند میں جو مطابع (اخبارات) ہیں اُن سے بچانے اور "محافظت" کرنے کے لئے دو قوانین مرتب کراکے نافذ کئے۔

کینیا

۱۹۲۳ء میں کینیا میں جو ہندی باشندے ہیں ان کے خلاف ایسی پالیسی برتی گئی کہ تمام ہندوستان میں اس پر غضب وغصہ کی ایک آگ لگ گئی۔ یہ پالیسی ہندوستانیوں کے اس قدر خلاف تھی کہ رائٹ آنریبل وی، ایس، سرینواس شاستری بھی یہ کہہ اُٹھے کہ ہندوستانیوں کو برطانوی قلمرو سے علیحدہ کوئی دوسری جگہ تلاش کرنی چاہئے اور آپ نے برٹش ایمپائر (سلطنت برطانیہ بھر کی) نمائش کے جو اُس سال اور اُس کے دوسرے سال ہوئی بائیکاٹ کی ہدایت کی۔ سر تیج بہادر سپرو نے جو معرکۃ الآرا خدمات اس معاملے میں اور نیز جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں کے معاملے میں انجام دی ہیں

بیشک قابل ذکر ہیں اور یاد رکھنے کے قابل ہیں۔

فرقہ وارانہ تعلقات

۱۹۲۴ء میں فرقہ وارانہ جھگڑے متعدد مقامات پر خصوصاً دہلی اور ممالک متحدہ میں ہوئے۔ اور وہ خونریزیاں ہوئیں کہ مہاتما گاندھی جنھیں نان کواپریشن میں ہندو مسلم اتحاد کے بارے میں بہت زیادہ انہماک تھا بہت زیادہ متاثر ہوئے اور آپ نے کئی دن کا فاقہ شروع کر دیا۔ مولانا محمد علی اُس سال کانگریس کے صدر تھے مولانا اور سوامی شردھانند نے اس وجہ سے دہلی میں اتحاد کانفرنس منعقد کی جس میں بہت زیادہ مجمع ہوا۔ خود اہل دہلی کثرت سے شریک ہوئے اور کانفرنس نہایت کامیاب رہی مگر نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ اس کانفرنس میں کانگریسی۔ لبرل۔ مسلم لیگی۔ ہندو مہاسبھائی سب شریک ہوئے۔ اس کے تھوڑے ہی دنوں بعد تہدید اور بمبازی کی تحریک کو فرد کرنے کی غرض سے بنگال میں ایک نہایت سخت قانون نافذ ہوا جس کے تحت میں مسٹر سوبھاش چندر بوس اور بہت سے دوسرے لوگ نظر بند کر دئے گئے۔ اب دوسری تمام جماعتوں کی کانفرنس بمبئی میں کی گئی۔ اس کانفرنس میں ایک سب کمیٹی مقرر ہوئی جس کے سپرد تمام جماعتوں میں ربط و ارتباط پھیلانے اور مختلف فرقوں اور مذہبوں کے درمیان اتحاد باہمی کے طرز و طریقوں پر غور کرنا اور لائحہ عمل مرتب کرنا تجویز کیا گیا۔ اس کمیٹی کے صدر مہاتما گاندھی اور سکریٹری پنڈت موتی لال نہرو بنائے گئے۔ جنوری ۱۹۲۵ء میں یہ کمیٹی دہلی میں ہوئی۔ ہندو مسلم اتحاد کے مسئلے کو لے کر یہ کمیٹی شروع ہوئی اور بس اسی پر ختم ہو گئی۔ ایک ہفتہ سے زائد لمبے چوڑے مباحثے ہوتے رہے مگر بے سود۔ میں نے اس کمیٹی میں اکثر کانگریسیوں کو مہاتما گاندھی مسٹر سی، آر، داس اور پنڈت موتی لال نہرو کی رائے سے پہلی بار شدید اختلاف کرتے ہوئے بچشم خود دیکھا ہے۔

فرقہ وارانہ مناقشات میں کوئی کمی رونما نہیں ہوئی، سنہ ۱۹۲۶ء کا کلکتہ کا جھگڑا۔ ڈھاکہ۔ بمبئی۔ ممالک متحدہ کے متعدد فرقہ وارانہ بلوے اور کانپور کا شرمناک، حیا سوز اور بہیمیت انگیز بلووں کی ذہنیتیں نمایاں تھیں جن سے صاف ظاہر تھا کہ ہندو مسلم اتحاد کس قدر دُور ہے۔ خود ممالک متحدہ میں کسی گورنر نے اپنی وداعی تقریر میں اس بات پر فخر کیا کہ اُسے اپنی ۵ سال کی گورنری میں ۸۳ فرقہ وارانہ بلووں کے انتظام کرنے پڑے۔

ہندو مہا سبھا یوں تو ہندو مہا سبھا بہت پہلے سے قائم تھی مگر کسی نے اس جماعت کی جانب توجہ ہی نہیں کی تھی۔ اور نہ پبلک کی نظروں میں اس کا کوئی وقار ہی تھا۔ البتہ فرقہ وارانہ جھگڑوں اور مناقشات نے اس میں ایک نئی روح پھونک دی اور اس نے نئے پَر پُرزے نکالے۔ ہندو اکابرین نے اس میں شریک ہونا شروع کر دیا جس کی خاص وجہ یہ کہی جا سکتی ہے کہ بعض کا خیال تھا کہ ہندو جماعت کے ساتھ انصاف کافی طور پر نہیں ہو رہا ہے۔ غلط یا صحیح جو بھی ہو، یہ خیال جڑ پکڑ گیا ہے کہ گورنمنٹ اور حکام کی پالیسی ہندو ترقی کی بخوبی معاون نہیں ہے۔ ان پر فرقہ پرست ہونے کا الزام عائد کیا جاتا ہے اور بہت سے ایسے ہندو بھی ہیں جن کے نزدیک مہا سبھا میں ہونا جرم کی حیثیت رکھتا ہے۔ تعجب تو اس کا ہے کہ مسلم لیگ اور دیگر مسلم اداروں کے بارے میں اس کے بالکل برعکس خیال ہے۔ خود کانگریس نے سنہ ۱۹۱۶ء میں جبکہ کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان مصالحت کی گفت و شنید ہو رہی تھی اور جس کا نتیجہ نام نہاد میثاق لکھنؤ[۱] کی صورت میں رونما ہوا

---

[۱] (مترجم۔ خود قابل مصنف مسٹر چنتامنی نے اس کا اعتراف کیا ہے کہ سنہ ۱۹۲۶ء سے پہلے ہندو مہا سبھا خود ہندو جنتا کی نظروں میں کوئی وقعت نہیں رکھتی تھی اور نہ اس میں زیادہ بڑے بڑے ہندو لیڈر شریک تھے۔ بھلا ایسی صورت میں کانگریس کیسے سنہ ۱۹۱۶ء میں مہا سبھا پر اعتماد کر کے اس کی درخواست قبول کرتی۔ یہ الزام کانگریس پر بالکل غلط اور بے بنیاد ہے)

ہندو مہا سبھا کی درخواست کو مسترد کر دیا اور خاطر خواہ برتاؤ نہیں کیا ہندو سیاسی رہنماؤں کی ایک اچھی خاصی تعداد جب مہا سبھا شروع شروع قائم ہوئی تھی اس انجمن میں شریک تھی جن میں پنڈت بشن نرائن در۔ بابو گنگا پرشاد ورما اور ڈاکٹر سپرو بھی تھے۔ ان میں سے زیادہ تو مر چکے ہیں اور چند نے اپنے خیالات بدل دئے ہیں۔ کچھ ایسے بھی ہیں جو پہلے فرقہ وارانہ انجمن کے خیال کے خلاف تھے مگر بعد میں ضرورت کو محسوس کر کے مہا سبھا میں آ کر شریک ہو گئے۔ پنجاب میں فرقہ وارانہ رنگ کا ہمیشہ زور رہا ہے اور یہاں کا قریب قریب ہر بڑا ہندو لیڈر مہا سبھا میں شریک رہا ہے۔ شرکا کی فہرست میں سوامی شردھانند۔ سر پرتل چٹرجی۔ رائے بہادر کالی پرسنا رائے۔ رائے بہادر لال چند۔ لالہ لاجپت رائے اور سر شادی لال قابل ذکر ہیں۔ پنجاب کے بعد عمل اور خیالات کے میدان میں بنگال کی باری ہے۔ پنجاب کے مشہور لیڈر رائے بہادر لال چند نے ۱۹۰۸ء میں فرمایا تھا کہ مسلمانوں کے ساتھ اتحاد ہندوؤں کی کمزوری کی دلیل ہے اور سوامی شردھانند کا قول ہے کہ "ہندو مسلم اتحاد سوراج کا نتیجہ ہو سکتا ہے سوراج کا سبب تو ہو سکتا ہی نہیں" ایک زمانے میں علاوہ پنجاب والوں کے اکثر مقامات پر یہ خیال ہمہ گیر تھا کہ کانگریس کے ہوتے ہوئے کسی دوسرے ہندو ادارے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ فرقہ وارانہ ثالث نامہ کی بابت کانگریس کا کیا خیال ہے اور ہندو مسلم اتحاد کا اس سے کیا تعلق ہے۔ ان باتوں کے ظاہر کرنے کی چنداں ضرورت نہیں کیونکہ یہ بالکل نئی بات ہے۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے جو حالات حاضرہ ہیں اور جو رنگ وہ اختیار کر رہے ہیں ان کو دیکھتے ہوئے اور ساتھ ہی ساتھ اپنا تعلق اس اہم نظریہ سے جو حصول سوراج کے لئے ہمارے پیش نظر ہے اس سے منطبق کرتے ہوئے

یہ نہیں ممکن ہے کہ اپنے فرقہ کی ضروریات کا خیال بھی نہ کیا جائے۔ اس پر بھی نظر رکھنی چاہیے کہ مسلم فرقہ وارانہ انجمنیں اپنے کام میں زور و شور کے ساتھ سرگرم ہیں۔ جداگانہ اور فرقہ وارانہ انتخاب کا متواتر قائم رہنا ایک اہم اور قابلِ غور مسئلہ ہے۔ مجالس قانون ساز میں ایسے افراد کا ہونا جو اپنے اپنے فرقہ کے نفع اور بہبودی کے لئے اپنے نقطۂ نگاہ سے سرگرم عمل ہیں ایک بدیہی مسئلہ ہے اور جو نیا آئین آرہا ہے وہ اس بات کو اور بھی ظاہر کر رہا ہے کہ اتحاد بین الملل کی مستقبل قریب میں خیر نہیں ہے۔ میں خود سرگرم محب وطن ہوں مگر میں اسے ہرگز فراموش نہیں کر سکتا کہ میں ہندو ہوں اور بحیثیت ایک سیاسی کارکن کے میرا یہ بھی فرض ہے کہ ہندوؤں کے مفاد سے چشم پوشی نہ کروں۔ ہندو ہند کی قوم کے جزو اعظم ہیں۔ مجھے یقین کامل ہے کہ میرے ہم مذہب کو میرا ہی سا احساس ہے۔ مسٹر برل کا قول ہے" اکثریت سے مغلوب ہونا بُرا ہے اور اقلیت سے مغلوب ہوجانا اور بھی بُرا ہے " میرا ایمان ہے کہ ہندو قوم کو ایک نمائندہ اور مضبوط ادارے کی ضرورت ہے جس کا مقصد فرقہ وارانہ تعصبات کی برداشت نہ ہو بلکہ جس کی غایت محض مدافعانہ ہو اور جس کے پیش نظر صرف قومی نصب العین ہو۔ مگر یہ ادارہ ہرگز ہرگز مذہبی دیوانوں کے ہاتھوں میں نہ پڑنے پائے۔ ایسوں کا وجود خدمت قوم کے حق میں سم قاتل ہے۔ ایسوں کے ساتھ اعتدال پسند جماعت کا مل کر کارآمد کام کرنا تو درکنار تعاون بھی نہیں کر سکتی۔

ہندوؤں کی پھوٹ یہ بدقسمتی کی علامت ہے کہ موجودہ ضروریات کا خیال کرتے ہوئے بھی پشتہا پشت کی پھوٹ ہندوؤں میں اب تک اُسی طرح باقی ہے۔ برخلاف اس کے مسلمان ہیں کہ

ان کا بچہ بچہ اتحاد کی ایک مثال ہے اور اپنے حقوق کی محافظت کے لئے اپنی سمجھ کے مطابق ہتھیلی پر سر لئے پھرتا ہے۔ ان کے بڑے بڑے رئیس اور زمیندار چھوٹے اور معمولی کسانوں کے ساتھ مل کر اپنے غربا کی نمائندگی گورنمنٹ کے سامنے کرنے کو تیار ہیں مگر ہندوؤں میں متوسط طبقہ کے لوگ بھی اپنے آزادیِ وطن اور حبِ وطنی کے جوش سے اپنی ملت کا کام نہیں کرتے ہیں ایسے کہنے پر تیار رہوں کہ ہندو حکام میں سے بیشتر اس خوف سے کہ اگر انصاف کریں گے تو انھیں حکام مسلمانوں کا دشمن خیال کریں گے اور ناخوش ہوں گے اکثر و بیشتر دوسروں کے ساتھ رعایت کرتے ہیں۔ (قابل مصنف مسٹر چنتامنی کا یہ الزام بالکل بے بنیاد ہے۔ ہندو حکام بیشتر انصاف پسند ہیں۔ مترجم)۔

ہندو اتحاد کے حق میں ایک اور بات مضرت رساں ہے بمعاشرتی اصلاحات کی مخالفت کی وجہ سے زیادہ کٹر ہندوؤں نے ہندو مہا سبھا کی آزاد خیالی سے گھبرا کر ایک اور ادارہ قائم کرنا چاہا ہے جو اپنے کو سناتنی کہتے ہیں۔ اگر معقولات کے نقطۂ نظر سے ذاتوں کے فلسفہ کو دیکھا جائے تو اس کے مفہوم ہی کچھ اور ہیں۔ مجھے ذاتوں کے فلسفہ پر یہاں کچھ نہیں دینا ہے اور نہ وہ میرے موجودہ مضمون سے متعلق ہے۔ ہاں یہ ضرور کہوں گا کہ ذات پات نے قوم کو نقصان پہونچایا ہے۔ لطف تو یہ دیکھئے کہ جو اپنی روزانہ کی زندگی میں ان ذات پات کے قیود سے اپنے کو آزاد کہتے ہیں اور ظاہر بھی ایسا ہی ہے پھر بھی ان جھگڑوں سے آزاد نہیں ہیں۔

نان برہمن (غیر برہمن) تحریک

مدراس کے غیر برہمنوں نے جن کی پیروی بمبئی اور ممالک متوسط کے غیر برہمنوں نے بھی کی ہے۔ حال میں غیر برہمنی اصولوں پر اپنی تنظیم کی ہے جسے مدراس میں جسٹس پارٹی کہا جاتا ہے۔ غیر برہمنی جسٹس پارٹی نے اپنے حقوق کے

حصول کی سعی سے برہمنوں کو بہت کافی نقصان پہونچایا ہے۔ یہی نہیں، برہمنوں اور غیر برہمنوں کی تفریق نے سیاسی میدان کو بھی اکھاڑا بنا لیا ہے جس سے ہندو قوم کو من حیث القوم نقصان پہونچ رہا ہے۔ اندھیر تو یہ ہے کہ نان برہمن جس کا نام نہاد جسٹس (انصاف پسند) پارٹی کے لوگ بھی شریک ہیں۔ نیچی ذاتوں کے ساتھ ویسے ہی برتاؤ کرتے ہیں جن کے لئے برہمن جماعت کو وہ بدنام کر رہے ہیں اور مورد الزام قرار دے رہے ہیں۔ نان برہمن جماعت صرف اپنی جماعت کے ممبروں تک محدود ہے جس کا اظہار جسٹس پارٹی نے جوائنٹ سلکٹ کمیٹی کے سامنے اپنی شہادت میں ۱۹۱۹ء میں خود کیا ہے۔ کیا کوئی شخص گورنمنٹ مدراس کو جسٹس پارٹی کی جنبہ داری کے معاملہ میں بری الذمہ قرار دے سکتا ہے۔ میرے خیال میں یہ محال ہے۔ گورنمنٹ آف انڈیا بل ۱۹۱۹ء کی جو سلکٹ کمیٹی تھی اس کے سامنے سر الکزنڈر کاڈو جو مدراس گورنمنٹ کے ایک با اثر ممبر تھے شہادت دے رہے تھے۔ لارڈ سنہا نے اس کے بابت ایسا ہی سوال سر الکزنڈر سے کیا۔ پہلے تو یہ حضرت صاف انکار کر گئے اور مدراس گورنمنٹ کو بالکل ہی غیر جنبہ دار کہہ گئے۔ مگر جب لارڈ سنہا نے انھیں ایک سرکاری تجویز دکھائی جس پر اے۔ جی۔ کاڈو کا دستخط تھا تو حضرت بہت خفیف ہوئے اور بغلیں جھانکنے لگے۔ مسٹر مانٹیگو کے سامنے سر کے۔ دی۔ رڈی کی شہادت بھی کچھ اس معاملہ میں ایسی ہی دلچسپ تھی۔

چھوت چھات کسی فرد بشر کو نہ چھونا اور اس کے سایہ سے پرہیز کرنا مذہباً ممنوع اور اخلاقاً مردود فعل ہے مگر لاکھوں اسے فرض مذہبی خیال کر کے صدیوں سے اس قبیح فعل کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ جن کے ساتھ یہ پرہیز برتا گیا ہے آج وہی اُس قوم سے اپنا بدلہ لینے کو تیار ہیں۔

معاشرتی اصلاحات میں ایسی چھوت چھات کا دفع کرنا ہمیشہ سے ایک جزو عظیم رہا ہے اور معاشرتی مصلح اس کے لئے ہمیشہ سرگرداں رہے ہیں۔ مگر اس تحریک میں نمایاں حصہ مہاتما گاندھی کا ہے۔ جو لوگ قیامت تک ہندوستان کو حکومت خود اختیاری دینے کے لئے تیار نہیں ہیں اس نیچ قوم کے وجود سے سیاسی فائدے اٹھا رہے ہیں۔ نیچ قومیں مسلمانوں اور عیسائیوں میں بھی ہیں مگر ایک مسلمان وزیر نے اپنی نیچ ذات کو مجلس قانون ساز میں داخل کیا ہے حالانکہ سیاسی مباحث میں نام تک بھی نہیں لیا جاتا ہے۔ مردم شماری سے ظاہر ہو رہا ہے کہ نیچ ذاتوں میں روز بروز زیادتی ہوتی جاتی ہے اور ہر نئی مردم شماری میں یہ بات خاص طور پر ظاہر کی جاتی ہے۔ مردم شماری کے کمشنر مسٹر (بعد میں سر) ایڈورڈ گیٹ تھے جنھوں نے سب سے پہلے نیچی ذاتوں کو ہندوؤں سے علیحدہ دکھانے کا حکم جاری کیا اس میں ایک خاص مصلحت تھی۔ میں اس جگہ اس حیرت انگیز بیان کا جو نیچی ذاتوں کے ایک قائد نے دیا تھا معرض بحث میں نہیں لانا چاہتا کہ ان کا ارادہ ہندو مذہب کو چھوڑ کر دوسرے مذہب میں داخل ہونے کا ہو رہا ہے گویا مذہب کا تعلق اعتقادات سے نہیں ہے بلکہ محض وہ ایک دنیاوی چیز ہے۔ بہر صورت یہ ایک کھلا ہوا مسئلہ ہے کہ ذات پات کی تفریق اور چھوت چھات کا پرہیز ہندو قوم کو اور کمزور بنا رہا ہے اور یہ ایک اہم مسئلہ ہے۔

محنت و مزدوری

دوسری تحریکیں جو قابل توجہ ہیں وہ مزدوروں کی تنظیم اور عورتوں کی بیداری ہے جن کو ہر محب وطن خوش آمدید کہنے کے لئے تیار ہے اور جن کا خیر مقدم اس کا فرض عین ہے۔ مزدوروں کی تحریک ابتک صرف شہری حلقہ اور خاصکر صنعتی کارخانوں کے مزدوروں تک محدود ہے حالانکہ زراعتی مزدوروں کی تنظیم اس سے کہیں زیادہ ضروری کام ہے مزدوروں کی تنظیم کا سہرا صرف چند محبان وطن کے سر ہے۔

اور میں یقین کے ساتھ اس بات کے اظہار کے لئے آمادہ ہوں کہ سرونٹ آف انڈیا سوسائٹی بمبئی کے ممبر میرے حبیب محترم مسٹر ین۔ ایم جوشی کا اس خاص خدمت میں سب سے زیادہ اور سب سے نمایاں حصہ ہے اور بیشک آپ مستحق صد آفریں ہیں یہ بات بھی مسرت خیز ہے کہ گورنمنٹ اور اس کی مجلس انتظامیہ کے متعدد ممبر اس تحریک میں برابر معاون و مددگار رہے ہیں اور اس تحریک کے اعتدال پسند طبقہ سے ان کی مستقل طور پر ہمدردی کا اظہار ہوتا رہا ہے۔ گورنمنٹ ہند کے جن حکام کا اس سلسلہ میں ذکر کیا جا سکتا ہے اس میں مسٹر اے، جی، کلو کی سرگرمیوں کا اعتراف لابدی ہے جنھوں نے مزدور جماعت کی فلاح و بہبود کے مسئلہ میں قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔ اس کے سلسلے میں لیبر کمیشن کی تعریف بھی ضروری ہے جس کی صدارت مسٹر وھٹلی نے جو سابق دار العوام کے اسپیکر تھے کی ہے۔

خواتین کی تحریک

میری رائے میں عورتوں کی کانفرنس کی سالانہ رپورٹ ہر شخص کو ضرور پڑھنی چاہیئے جو فلاح عامہ کی دلدادہ خواتین کی ان دلچسپیوں اور انہماک کی جو وہ اپنی بہنوں کے فلاح و بہبود کے لئے سال بہ سال کرتی ہیں آئینہ ہیں۔ ہند کی تعلیم یافتہ خواتین میں ایک نئی زندگی کی لہر دوڑ رہی ہے اور ان کے قلوب ایک درخشاں مستقبل کی تعمیر کے لئے مضطرب ہیں۔ بیشک ان خواتین نے ایسی ترقیاں کر دکھائی ہیں کہ اگر مسٹر رانا ڈے جو اصلاح معاشرت کے گذشتہ انیسویں صدی کے سب سے بڑے مجدد تھے اگر آج زندہ ہوتے تو مارے خوشی کے پھولوں نہ سماتے۔ ہماری قوم کی ترقی کی راہ میں جہاں بیم موج، دشت تاریک ہماری ہمتوں کو پست کئے دے رہی ہیں وہاں ہماری خواتین کا حب الوطنی میں یہ گرمجوش اور انہماک ہمیں زرین مستقبل کا پیغام بھی دے رہا ہے اور یہ بات کس قدر ہمت افزا اور

باعث نازش ہے کہ ان خواتین میں ایک بھی ایسی نہیں ہے جو فرقہ وارانہ تحریک و منافشات میں حصہ لینے کو تیار ہو بلکہ اس کے برعکس سب نے یک زبان ہو کر فرقہ پرستی سے اظہار نفرت کیا ہے۔ قابل آفرین و ستائش ہیں وہ ہستیاں جو مل کر قوم کا گیت گائیں اور فرقہ پرستی کو مادرِ وطن کی چوکھٹ پر بھینٹ چڑھانے کے لئے تیار ہوں۔

مڈی مین کمیٹی میں پھر دوبارہ تاریخ وار سلسلہ واقعات شروع کرنا چاہتا ہوں۔ ۱۹۲۴ء میں لارڈ الیور وزیر ہند تھے اُسی زمانے میں رفارم انکوائری کمیٹی جس کے صدر سر الکزنڈر مڈی مین جو ہوم ممبر تھے مقرر ہوئے۔ یہ کمیٹی منٹیگو چیمسفورڈ اسکیم کے کاموں کی تفتیش کے لئے اور نیز ایسے سفارشات تجویز کرنے کے لئے جن سے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۱۹ء میں ترمیم نہ ہو سکے مقرر کی گئی تھی۔ جو شہادتیں اس کمیٹی نے قلمبند کیں بہت معنی خیز تھیں۔ اگر آپ یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ انگریز حکام کا وہ طبقہ جو کچھ بھی ہندوستان کو نہیں دینا چاہتا۔ کیسے اور کس طرح مسٹر مانٹیگو کے اصلاح افگن ارادوں کے درپے آزار تھا تو آپ کو یہ بات صوبوں کی گورنمنٹ کی وہ رائیں جو کمیٹی کو بھیجی گئی تھیں صاف صاف بتا دیں گی اور گورنروں نے اپنے وزرا کی معیت میں تو وزرا اور مجالس قانون ساز کے کاموں کو ہیچ ہی قرار دے رکھا تھا مجالس قانون ساز مین اور مستقل حکام کے درمیان اس کی بابت کافی اختلافات بھی پیدا ہوئے اور سابق وزرا نے اپنے تلخ تجربات کے جو قصے سنائے وہ کافی نصیحت دہ ہیں۔ کمیٹی نے نیگرم سفارشات کیں اس کے چار ممبروں۔ سر سیوا سوامی ایر۔ سر تیج بہادر سپرو۔ مسٹر جناح اور ڈاکٹر برنجپی نے اپنی علحدہ رپورٹ پیش کی جس کا نتیجہ یہ تھا "کوئی ایسی درمیانی حکومت نہیں سوچی جا سکتی ہے جو

ان سیاسی اور حکومتی دقتوں کو حل کر سکتی ہو جو ہمارے پیشِ نظر ہوئی ہیں" پھر کہا گیا ہے " ہمارے خیال میں یہ دریافت کرنے کی بات نہیں ہے کہ کون سا درمیانی طرزِ حکومت نکالا جا سکتا ہے بلکہ یہ دریافت کرنا چاہئے کہ دستورِ اساسی کو کس طرح ایسا بنایا جائے کہ اُسے استحکام ہو اور اس میں کون سی ایسی باتیں موجود ہوں کہ اُس میں ترقی خود بخود نمایاں ہوتی رہے جس کی وجہ سے گورنمنٹ کو استحکام ہو اور رعایا خوشی سے اس میں حصہ لینے کو تیار ہو" ان ممبران نے ان دقتوں کو جلد حل کر ڈالنے کے لئے زور دیا۔ سر محمد شفیع نے کثرت رائے والی رپورٹ پر اپنے دستخط ثبت کئے تھے مگر چند ہی دنوں بعد اپنے عہدے سے سبکدوش ہونے کے بعد آپ نے اخبارات میں صاف صاف یہ اعلان کر دیا کہ بحیثیت ایک عہدہ دار کے انھوں نے اپنی رائے اکثریت کے ساتھ دی تھی مگر غیر عہدہ دار کی حیثیت سے اُنھیں اقلیت کی رائے سے کلّی اتفاق تھا۔ اس اقلیت کی رائے پر ہی کوئی توجہ نہیں کی گئی بلکہ حکام کی جماعت نے جو معمولی سفارشات کی تھیں ان پر بھی کوئی التفات نہیں ہوئی۔

سکوں کی تبدیلی (ایکسچینج)

اس وقت سکوں کی تبدیلی کا مسئلہ خاص طور پر معرض بحث میں تھا یعنی روپیہ کی تبدیلی کا نرخ ۱۶ شلنگ رکھا جائے یا ۱۸ شلنگ۔ سب کے سب ہندوستانی باتفاق رائے ۱۶ شلنگ کے نرخ کے مؤید تھے اور حکام ۱۸ کا نرخ چاہتے تھے اور یہی ۱۸ والا نرخ بہت معمولی کثرت رائے سے مجلس قانون ساز میں پاس ہو کر قانون بن گیا۔ اس وقت تک یہ مسئلہ طے نہیں ہوا ہے۔ ہندوستان کے بہت سے ایسے لوگ جن کی رائے اس مسئلہ پر مسلمہ کہی جا سکتی خیال کرتے ہیں کہ ۱۸ والا نرخ ہندوستان کی تجارت و حرفت کو بیحد مضرت رساں ہے

اور تجربے نے بھی یہی بات آج تک ثابت کی ہے۔ اور کہا جاتا ہے کہ ۱۸ شلنگ فی روپے کا نرخ زراعت پیشہ کے فرق کے مسئلہ کو اور بد سے بدتر کر رہا ہے۔ ۱۹۳۱ء میں انگلستان نے سونے کا بھاؤ گھٹا دیا مگر کوتاہ بین وزیر ہند سر سیموئل ہور نے ہندوستان کا بھاؤ وہی قائم رکھا۔ اور اس وقت سے ہندوستان سے سونے کا ایک سیلاب کھنچ کر انگلستان پہنچ گیا۔ دوسرے ممالک نے اپنے سونے کی پوری محافظت کی اور خوب سونا بٹورا مگر ہندوستان سے سونے کی مسلسل برآمدگی جاری رہی اور گورنمنٹ ملک کے لئے اسے ایک نعمت عظمیٰ بتاتی رہی ع

بہانے ڈھونڈ کے پیدا کئے جفا کے لئے

۱۸۹۳ء سے برابر سٹی آف لندن (City of London) انڈیا آفس کے ذریعہ سے سکوں کی تبدیلی اور بھاؤ کی پالیسی کا حکم اعظم بنا رہا ہے اور ایسے باخبر اور مستند زمانہ اکابرین کی رائے کی جس میں دادا بھائی نوروجی۔ مسٹر آر، سی، دت۔ ڈی، ای، واچا۔ جی سبرامنیا ایر۔ اور ان کے بعد کے آنے والوں میں سر وادیباد لال کے نام گنائے جا سکتے ہیں قدر نہیں کی گئی۔ طرفہ تماشہ تو یہ ہے کہ اب جو دستور اساسی نیا بن کر آیا ہے اس میں سکوں کی تبدیلی اور بھاؤ کے مسئلہ کو گورنمنٹ آف انڈیا یا مجلس قانون ساز کو نہیں دیا ہے بلکہ اس کے رو سے اسے گورنر جنرل کی رائے پر چھوڑ دیا ہے۔ اس ۴۲ برس کی فرسودہ پالیسی کی سنہ ۱۹۲۰ء ایک مثال کافی ہے جس کو ٹائمس آف انڈیا نے "منظم لوٹ" کے نام سے موسوم کیا ہے۔

سوامی شردھانند کا قتل

۱۹۲۶ء کا آخری حصہ ایک خونی اور افسوسناک سانحہ سے رنگا ہوا ہے۔ کسی مسلمان نے سوامی جی کو ان کے گھر میں آکر قتل کر ڈالا۔ اس قتل کی وجہ

سوائے اس کے اور کیا ہو سکتی ہے کہ آپ ہندوؤں کے معاملات کے بڑے زبردست حامی تھے ۔ اور قوم ہند کے انمول جواہر تھے ۔ آپ پہلے وکالت کرتے تھے بعد میں لالہ (آخر میں مہاتما کا لقب تھا) منشی رام نے ترک دنیا کر دیا اور کانگریس کا گروکل قائم کر کے اپنا نام تاریخ ہند کے اوراق میں روشن اور زرّیں حروف میں لکھ گئے ۔ یہ مدرسہ اپنی شان اور اپنے رنگ کا تمام ملک میں نرالا ہے ۔

سوامی جی جنھوں نے سنیاسی ہونے پر اپنا نام شردھانند رکھا تھا تمام عمر ہندو قوم کی ترقی میں مصروف رہے اور آپ قومی ترقی ۔ معاشرتی اصلاح ۔ اور تعلیم کے ذریعہ سے کر رہے تھے ۔ حب وطنی آپ کی سرشت میں تھی اور پنجاب کے مارشل لا کے مظالم نے آپ کو عملی سیاسی سرگرمیوں میں کھینچ لیا تھا ۔

۱۹۱۹ء میں امرتسر کانگریس کی مجلس استقبالیہ کے آپ صدر تھے آپ کے قتل سے تمام ہند کے گوشہ گوشہ میں ہندو قوم کو صدمہ پہونچا اور غضب و غصہ کی ایک لہر دَوڑ گئی ۔ آپ کی موت نے ہندو قوم کو اور ہندوستان کو ایک بوڑھے ہوئے بزرگ سے محروم کر دیا جن کے خدمات اہل وطن کے لئے ہمیشہ انمول جواہرات کے مانند سمجھے جائیں گے ۔

فوجی پالیسی

ہندوستان میں برطانیہ کی فوجی پالیسی پر بہت زیادہ خرچ ہوتا رہا ہے اور مصارف اس قدر زیادہ رہے ہیں کہ گویا ہندوستان اس بار سے دبا جا رہا ہے ۔ ان مصارف کو کم کرنے کے لئے جدوجہد اس پورے دَور میں برابر جاری رہی ہے ۔ ہندوستان کی محافظت کے مسئلہ پر مسٹر رابرٹ نائٹ نے جو ایک برطانوی صحافت نگار گزرے ہیں اور جن کے خدمات کے ہم ہمیشہ ممنون رہیں گے بہت کافی غور کیا ہے ۔ آپ نے ہندوستان کی محافظت کے متعلق ہندوستان اور برطانیہ کے مصارف کی جانچ

کے دو طریقے نکالے ہیں جن سے دونوں ملکوں کے فوائد و ضروریات کو مدنظر رکھ کر جانچنا چاہیے۔ سچ تو یہ ہے کہ انگلستان نے ہندوستان پر نا قابل برداشت بار ڈال رکھا ہے۔ ہنری فاسٹ نے جو ہندوستان کے اپنے زمانے میں بہت بڑے ہمدرد تھے مالیات کی ایک رقم کو "تکلیف دہ ذلت کا شاہکار" اعلیٰ

Masterpiece of meloncholy (meanness)

قرار دیا تھا اور حقیقت بھی یہی ہے کہ پوری پالیسی کو تکلیف دہ ذلتوں کے انبار کے نام سے یاد کیا جا سکتا ہے۔ دکھانے کو تو کمیشن اور کمیٹیاں یکے بعد دیگرے برابر بیٹھا کیں مگر اس مفلس ملک کو اس بار سے نجات نہ نصیب ہوئی۔ لارڈ میو سے لے کر تقریباً ہر وائسرائے نے ہندوستان کے ساتھ جو یہ نا انصافی برتی ہے اس پر صدائے احتجاج بلند کی گئی مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ خود لارڈ نارتھ بروک نے ۱۸۹۳ء میں دارالخواص (ہاؤس آف لارڈس) میں اس مسئلہ پر بحث کی اور اسے مبحث قرار دیا۔ وزیر ہند نے اس نا انصافی کا اعتراف کیا مگر یہ کہا کہ انڈیا آفس اس مسئلہ کو اٹھانا نہیں چاہتا اور تجربہ اس کا شاہد ہے کہ جب کبھی اس میں تخفیف ہوتی ہے تو ہندوستان کو کسی نئے ٹیکس کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ سر والٹر لٹن نے جو سائمن کمیشن کے مشیر مالیات تھے توضیح کے ساتھ یہ بتا دیا ہے کہ کسی ملک کو اس قدر زیادہ فوجی مصارف نہیں برداشت کرنے پڑتے جس قدر کہ ہندوستان کو برداشت کرنے پڑتے ہیں۔

جنگ عظیم کے ایک سال بعد سر ولیم میر نے جو ہوم ممبر تھے اور جنھوں نے ایمانداری سے ہندوستان کا نمک کھایا ہے ایک رپورٹ تحریر کی ہے جس میں ہدایت کی ہے کہ جنگ کے بعد ہندوستان کے فوجی مصارف کو ۲۵ کروڑ سالانہ سے بڑھانا نہ چاہیے۔ مگر افسوس ہے کہ بعض سال تو دو سے زائد صرف ہوتا ہے

اور اس وقت بھی تقریباً دو نے کے قریب صرف ہو رہا ہے " ہوم چارجز " اور فوجی مصارف کی وجہ سے اقتصادی ترقی ۔ معاشرتی فلاح اور تعلیمی فروغ کے لئے روپیہ نہیں بچتا اور یہ وہی مصارف ہیں جن کی بابت دادا بھائی عمر بھر جد وجہد کرتے رہے ۔ میں اس مقام پر لارڈ سنہا کی ایک گفتگو جو مجھ سے ہوئی تھی نقل کرتا ہوں ۔ لارڈ سنہا نے فرمایا کہ اُن سے زیادہ کوئی دوسرا ہندوستانی انگریز کو نہیں جانتا اور نہ کسی ہندوستانی کو انگریزی اوصاف کا اُن سے زیادہ اعتراف ہے ۔ آپ نے فرمایا مگر جب کبھی پونڈ ۔ شلنگ ۔ پنس کا معاملہ ہو تو ہرگز انگریز پر اعتبار نہ کرو ۔ کسی انگریز نے خود کہا ہے کہ انگریز کی شخصیت کا اندازہ اس طرح کیا کرو " پہلے رقم ۔ اس کے بعد دماغ اور پھر اس کے بعد دل "۔

غیر ملک کے باشندوں کی سلطنت نے ہندوستان کے قلب کو برطانوی فوجی پالیسی سے زیادہ کسی اور بات نے مجروح نہیں کیا ہے ۔ سنہ ۱۹۱۸ء تک ہندوستانی کمیشن کی جگہوں سے بالکل الگ تھلگ رکھے جاتے تھے ۔ اسی سال سے بہت کم کمیشن کی جگہیں ہندوستانیوں کو دی جانے لگی ہیں اور جو رفتار ہندوستانیوں کو جگہوں کے دیئے جانے کے لئے اختیار کی گئی ہے اگر یہی قائم رہی تو پوری فوج ہندوستانی ہونے کے لئے تین سو برس چاہئیں ۔ مشہور و معروف اسکین کمیٹی نے جو تھوڑی بہت اشک شوئی کی تھی اس پر بھی عمل نہیں کیا گیا جس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ اس کمیٹی میں بیشتر ہندوستانی شریک تھے اور یہی ہندوستانیوں کی کثرت سائمن کمیشن کی آنکھوں میں کھٹکی جو اس کے سفارشات پر عمل درآمد نہیں ہوا ۔ پہلی راونڈ ٹیبل کانفرنس کی دفاعی سب کمیٹی کے سفارشات جو بہت ہی معمولی تھیں ان پر بھی عمل درآمد نہیں ہوا ۔ اس کے چند ہی ماہ بعد ایک اور کمیٹی مقرر ہوئی جس کے صدر سر فلپ چٹ وڈ تھے ۔

اس کی سفارشات تو اس قدر رجعت پسندانہ تھیں کہ گوالیار کے جنرل راجوید کو آخر ش اختلاف ہی کرنا پڑا۔ میں نے خود اپنے ایک خطبہ میں آج سے ۱۵ برس پہلے کہا ہے۔

"کیا انگلستان ہندوستان کا اعتماد چاہتا ہے۔ اُسے خود ہندوستان پر اعتماد کرنا چاہئے۔ برطانوی فوجی پالیسی اس خلوص کی کسوٹی ہے۔"

میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ انگلستان نے اپنے خلوص کو ثابت نہیں کیا۔ میں اس مضمون کو ختم نہیں کر سکتا تاوقتیکہ اپنے معزز اہل وطن سر سیوا سوامی ایر کے خدمات کا جو آپ نے اپنی معلومات۔ قابلیت۔ دانشمندی اور انہماک سے اس مسئلہ میں انجام دی ہیں اعتراف نہ کر لوں۔

اب میں اپنے مضمون "آئینی اصلاحات" کی جانب رجوع ہوتا ہوں انگلستان کی رجعت پسند (ٹوری) گورنمنٹ نے تمام ہندوستان بھر کی اس استدعا کا کہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۱۹ء میں تبدیلیاں کر کے ذمہ دار حکومت دی جائے کچھ خیال نہ کیا اور اس ایکٹ میں جس اساسی کمیشن کا حوالہ تھا اسے دو برس کی مدت سے قبل ہی مقرر کر دیا۔ لارڈ برکن ہیڈ نے جو اس وقت وزیر ہند تھے صاف صاف اس بات کا اقرار کیا کہ وہ اس کمیشن کا تقرر کہیں آیندہ آنے والی لیبر گورنمنٹ کے لئے نہیں چھوڑ دینا چاہتے۔ سائمن کمیشن اسی کاوش کا نتیجہ ہے۔

سائمن کمیشن

سائمن کمیشن کے سات کے ساتوں ممبر انگریز تھے۔ یہی نہیں کہ ہندوستانیوں کو صرف اس وجہ سے علیحدہ رکھا گیا ہو کہ وہ ہندوستانی ہیں بلکہ اُن کی علیحدگی کی وجہ بتا کر ہماری اور مزید ذلت کی گئی تھی۔ یہ کہنا کہ کمیشن کے ممبروں کو پارلیامنٹ کا بھی ممبر ہونا ضروری تھا محض ایک بہانہ ہوتا اس لئے کہ اس وقت دو ہندوستانی لارڈ سنہا دارالخواص اور مسٹر سکلتوالا دارالعوام کے ممبر تھے مگر برطانوی حکومت لارڈ سنہا کو بھی ممبر بنانا

پسند نہ کرتی تھی۔ ہندوستانیوں کی تحقیر محض اس وجہ سے کی گئی تھی کہ وہ "خدا کے خاص بندے انگریز نہ تھے" اس بات پر لیبر پارٹی کے لیڈر نے بھی اتفاق کیا تھا۔ اس کا جواب ہندوستان نے کمیشن کے بائیکاٹ سے دیا۔ اس بائیکاٹ کی قیادت سر تیج بہادر سپرو نے کی اور اس بائیکاٹ میں سر سیوا سوامی ایر ایسے لوگ شریک ہوئے اس میں کانگریسیوں اور لبرل نے یک زبان اور ایک آواز ہو کر حصہ لیا۔ اس بائیکاٹ کا جواب گورنمنٹ نے لاٹھیوں سے دیا جس کی زد میں جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ لالہ لاجپت رائے بھی آگئے۔ کمیشن کی جانچ پڑتال میں اہل ملک نے کوئی دلچسپی نہ لی اور جب سنہ ۱۹۳۰ء میں اس کی تعویق آمیز رپورٹ شائع ہوئی تو اس کی سفارشات پر اہل ملک نے انتہائی استعجاب ظاہر کیا جس میں سے چند یہ ہیں۔ ہندوستان کو ڈومینین اسٹیٹس نہ دیا جائے۔ اور اسے ذمہ دار مرکزی حکومت نہ ملنی چاہیے مجلس قانون ساز کی جگہ ایسا ادارہ یا مجلس ہو جس کا انتخاب براہ راست نہ ہو تاکہ حکومت کے احکام وہ زیادہ تسلیم کئے جا سکیں۔ اور ہندوستان میں جو فوج رہے وہ انگلستان کی گورنمنٹ کے تحت تصرف میں رہے۔ ہندوستان اس کے مصارف برداشت کرے۔ زیادہ کیا کہا جائے۔ سر سیوا سوامی ایر نے خوب فرمایا ہے "کہ اس رپورٹ کو ردی کی ٹوکری میں ڈال دینا چاہیے"۔

نہرو کمیٹی سائمن کمیشن کے بائیکاٹ ہی سے ہندوستان نے اپنی ذلت کا جواب نہیں دیا بلکہ نہرو کمیٹی کا تقرر بھی کانگریس نے دوسری پارٹیوں سے اشتراک عمل کر کے کیا جو اس تحقیر کا ترکی بہ ترکی جواب تھا۔ اس کمیٹی کا مقصد ایک ایسے دستور کا مرتب کرنا تھا جو سب کی باہمی امداد کا نتیجہ ہو اور ملک کی ضروریات بھی جس سے پورے طور پر پوری ہوں۔ چنانچہ اس کمیٹی نے اپنی رپورٹ سنہ ۱۹۲۸ء کے وسط میں شائع کی۔ یہ رپورٹ کمیٹی کے صدر پنڈت موتی لال نہرو کے نام سے

موسوم ہے۔ اس کمیٹی کے ممبروں میں سے سر تیج بہادر سپرو۔ سر علی امام اور مسٹر سوباش چندر بوس تھے۔ اسی سال اگست میں لکھنؤ میں آل پارٹیز (تمام پارٹیوں کی) کانفرنس ہوئی جس نے اس رپورٹ کو قبول کیا۔ اس کانفرنس کے صدر ڈاکٹر انصاری جو اُس سال کانگریس کے صدر بھی مقرر ہوئے مگر مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت نے اس رپورٹ کو انتخاب مشترکہ کی وجہ سے جس کے لئے نہرو کمیٹی نے سفارش کی تھی مسترد کر دیا اور مولانا محمد علی مرحوم نے جو سابق میں کانگریس کے صدر رہ چکے تھے اس رپورٹ کو قبول نہیں کیا۔ اور مسلمانوں کی اکثریت کا ساتھ دیا۔ دسمبر کے مہینے میں کلکتہ میں قومی اجتماع کیا گیا جسے نیشنل کنونیشن کہتے ہیں دن بھر کی سخت جد و جہد۔ بحث و تکرار کے بعد ڈومینن اسٹیٹس (حکومت مستعمراتی) بجائے مکمل آزادی کے ہندوستان کا نصب العین سیاسی قرار پایا مگر فرقہ وارانہ انتخاب آخر میں وہ سخت چٹان نکلا جس پر تمام سفارشات ٹکرا کر پاش پاش ہو گئیں اور قومی اجتماع کا کوئی مفید نتیجہ نہ نکلا۔

لارڈ ارون کا اعلان

ہندوستان کے وائسرائے لارڈ ارون کا بھی ہاتھ سائمن کمیشن کی ساخت میں تھا جس کے صرف انگریز ہی ممبر مقرر ہوئے تھے۔ مگر حالات اور واقعات سے جو کمیشن مذکور کے بارے میں رونما ہوئے ان سے لارڈ ارون کو یقین کامل ہو گیا کہ بغیر کسی نئے طریقے کے اختیار کئے ہوئے جو ہندوستانیوں کو پسند ہو مفر نہیں ہے۔ لارڈ ارون ایماندار اور خوفِ خدا رکھنے والے آدمی تھے اور لارڈ رپن کے بعد نیک نیتی اور آزادی رائے میں کوئی دوسرا آپ کے مقابل نہیں گذرا ہے۔ آپ کو اپنی رائے کو ہمت مردانہ کے ساتھ ملک معظم کی گورنمنٹ کے روبرو پیش کرنے کی قوت قدرت نے عطا کی تھی چنانچہ آپ نے وہی کر دکھایا۔ اسے ہندوستان کی خوش قسمتی کہئے

کہ جس زمانے میں آپ انگلستان گئے اُس وقت لیبر گورنمنٹ کی حکومت تھی اور مسٹر وج اووڈبن جیسا سچا اور اچھا وزیر ہند تھا۔ لارڈ ارون کی کوششوں کا نتیجہ راونڈ ٹیبل کانفرنس کی صورت میں رونما ہوا جس کا اعلان آپ نے ۳۱ اکتوبر سنہ رواں کو کیا جس پر ہندوستان میں اظہار مسرت ہوا۔ لبرل فیڈریشن نے چنانچہ اس کا خیر مقدم الفاظ ذیل میں کیا تھا۔

"سنہ ۱۹۱۷ء کے اعلان نے جس ارادہ کا اظہار کیا تھا اسکا یہ (اعلان) استحکام کے ساتھ اعادہ کرتا ہے اور ڈومنین اسٹیٹس کو ہندوستان کا نصب العین ذمہ داری کے ساتھ قرار دیتا ہے اور (یہ اعلان) صاف صاف برطانوی ہند اور ریاستی ہند کو متحد کر کے زیادہ وسیع ہندوستان بنانا چاہتا ہے اور ہندوستان کے اس مطالبہ کو منظور کر کے ہندوستان کے دستور اساسی کی تشکیل میں برطانوی وزارت کے مقابلہ میں برابری کا درجہ دیتا ہے۔"

کانگریس کا رویہ

راونڈ ٹیبل کے کاموں میں شرکت کے لئے کانگریسی لیڈروں کو ہر طرح کی ترغیب دی گئی مگر ان لوگوں نے اپنی شرکت کے لئے چند ناممکن العمل شرائط پیش کیں اور والسرائے سے اتحاد عمل کا قطعی طور پر انکار کرنے کے بعد ہی فوراً لاہور میں پنڈت جواہر لال نہرو کی صدارت میں کانگریس کمیٹی منعقد کر کے ہند کی مکمل آزادی کی تجویز پاس کر ڈالی اور تھوڑے دنوں بعد سول نافرمانی شروع کر دی۔

گورنمنٹ نے اس کا جواب مسلسل دبانے والے وقتی احکام سے دینا شروع کر دیا۔ ان وقتی احکام میں قانون مطابع سنہ ۱۹۱۰ء کا دوبارہ نفاذ بھی تھا اکی بار زیادہ سخت قیود اور نکات کے ساتھ بنایا گیا تھا چند دیگر وقتی قوانین تو ایسے نافذ کئے گئے جن کے روسے پولیس اور انتظامی افسروں کو دیوانی کے نہایت وسیع

اختیارات دیدیئے گئے تھے اور یہ اختیارات بہت سختی سے برتے گئے۔ تمام دنیا میں لوگوں کے جان و مال کی محافظت لبرل پارٹی کا عین اصول رہا ہے۔ انھیں اصولوں کو پیش نظر رکھ کر لبرل پارٹی نے کانگریس کی قانون شکنیوں کو ناپسند کیا خصوصًا ایسے وقت میں جب کانگریس کو راونڈ ٹیبل کانفرنس میں شریک ہونا چاہیئے تھا جو نہایت کارآمد کام ہوتا مگر ساتھ ہی ساتھ آئینی طرز کو پیش نظر رکھتے ہوئے گورنمنٹ کی جانب سے جو سختیاں ہو رہی تھیں ان کو بھی نامناسب مردود قرار دیا۔

پہلی راونڈ ٹیبل کانفرنس

پہلی راونڈ ٹیبل کانفرنس لندن میں نومبر سنہ ۱۹۳۰ء میں منعقد ہوئی جس کا افتتاح خود ملک معظم نے کیا اور جس کے صدر وزیر اعظم ہوئے۔ اس میں انگلستان کی تینوں بڑی پارٹیوں کے افراد اور ہندوستان کی ہر جماعت اور ہر فرقہ کے اشخاص شریک ہوئے البتہ کانگریس اس سے کنارہ کش رہی۔ اشخاص کا لفظ میں نے اس لئے استعمال کیا ہے کہ جو ہندوستانی اس میں شریک تھے وہ گورنمنٹ کے نامزد ممبر تھے جنھیں قوم و ملک نے منتخب کرکے نہیں بھیجا تھا۔ بہرحال ان لوگوں نے جو کچھ اُن سے ممکن تھا ہندوستان کی بھلائی کے لئے کیا۔ ان افراد میں بہت سے رجعت پسند اور فرقہ پسند بھی تھے۔ میرا اس وقت خیال تھا اور بعد میں بھی میں نے اس پر غور کیا ہے اور میری رائے یہ ہے کہ اگر کانگریس نے پہلی راونڈ ٹیبل میں شرکت کی ہوتی تو اس کا نتیجہ کہیں زیادہ بہتر ہوتا۔ اس کانفرنس نے براہ راست کوئی خاص تجویز یا سفارش نہیں کی جو غالبًا صدر کے نئے طریقوں اور کمی وقت کی وجہ سے نہیں ہوسکی۔ کانفرنس کی سب کمیٹیوں نے جو سفارشات کی تھیں حالانکہ وہ بہت زیادہ اچھی نہیں تھیں پھر بھی اگر انھیں سے ایکٹ مرتب کیا جاتا تو ہندوستان کو حکومت خود اختیاری کے اختیارات کہیں زیادہ ملے ہوتے۔ ایسا نہیں ہوا۔ ایک حد تک کانفرنس

کامیاب رہی اور مسٹر گاندھی اور وائسرائے سے گفتگو کے بعد کانگریسی لیڈر فوراً جیل سے بری کردئے گئے۔ کانگریس نے سول نافرمانی کی تحریک روک دی اور گورنمنٹ نے سب سیاسی قیدیوں کو رہا کردیا۔ مسٹر گاندھی اور وائسرائے کی گفتگو کو گاندھی۔ اروِن میثاق (پیکٹ) کہا جاتا ہے۔ تھوڑے دنوں بعد فریقین میں غلط فہمیاں شروع ہوگئیں کہ اس میثاق پر پورے طور پر عمل نہیں ہو رہا ہے اور ایک نے دوسرے کو موردِ الزام قرار دینا شروع کردیا۔ ایک بار تو نوبت یہاں تک پہونچی کہ مہاتما گاندھی نے اسی وجہ سے دوسری راونڈ ٹیبل کانفرنس میں شرکت کا خیال ترک کردیا۔ نئے وائسرائے لارڈ ولنگڈن بیشک قابل مبارکباد ہیں کہ آپ نے اس گتھی کو سلجھا دیا اور مہاتما گاندھی کانگریس کے نمائندہ کی حیثیت سے دوسری راونڈ ٹیبل کانفرنس میں شریک ہوئے۔ کانگریس کے چند دیگر اکابرین نے کانفرنس میں اپنی شخصی حیثیت سے شرکت کی جس میں سے پنڈت مدن موہن مالوی اور مسز نیڈو بھی ہیں۔

دوسری راونڈ ٹیبل کانفرنس

مہاتما گاندھی نے اپنے کو کانگریس کا واحد نمائندہ بنا کر غلطی کی۔ اپنی قوت کا صحیح اندازہ بھی آپ نہ کر سکے اور نہ اس پر غور کیا کہ کانفرنس میں تعداد کا کیا اثر ہوتا ہے۔ تدبر تو کانفرنس میں تعداد کے بڑھانے اور اپنی شخصیت کو اس کے لحاظ سے جتانے کا مؤید ہے۔ اسی سال موسم بہار میں لکھنؤ میں مسلم نیشنلسٹ (محبان وطن) کی کانفرنس ہوئی جس کے صدر سر علی امام تھے اس میں انتخاب جداگانہ کے خلاف بہت دھوم دھام سے تجویز پاس ہوئی۔ کوئی دوسرا مسلم نیشنلسٹ سوائے سر علی امام کے راونڈ ٹیبل کانفرنس میں نہیں لیا گیا۔ مگر سر علی امام کانفرنس میں چپ رہے جس کی وجہ نہیں بتائی جا سکتی ہے۔ پہلی راونڈ ٹیبل کانفرنس کی طرح

دوسری راونڈ ٹیبل کانفرنس میں بھی فرقہ وارانہ مسائل پر بہت غور وخوض ہوا مگر کوئی سمجھوتہ نہ ہوسکا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ لیبر پارٹی کے ہاتھوں سے عنان حکومت چھوٹ کر ٹوری (رجعت پسند) جماعت کے ہاتھوں میں آچکی تھی۔ ابکی سال جو برطانوی سند دبین تھے وہ سب کے سب دوسرے ہی خیال کے لوگ تھے۔ مسٹر ویج اوڈ بن کی جگہ پر سرسیموئل ہور وزیر ہند تھے جس سے پتہ چل سکتا ہے کہ نتیجہ کس رنگ کا ہوگا اور اونٹ کس کل بیٹھنے والا تھا۔ دوسری کانفرنس پہلی سے کہیں زیادہ ناکامیاب رہی۔

پہلی راونڈ ٹیبل کانفرنس کے اختتام پر جبکہ مسٹر ویج اوڈ بن وزیر ہند تھے تمام سیاسی قیدی رہا کر دئے گئے تھے اور سول نافرمانی ترک کر دی گئی تھی۔ دوسری کانفرنس کے اختتام پر جب توڑیوں کی گورنمنٹ تھی اور سرسیموئل ہور وزیر تھے سول نافرمانی کا بازار ۱۹۳۰ء سے کہیں زیادہ گرم تھا اور اس کا جواب گورنمنٹ تشدد کے ساتھ نہایت کھلے کھلے دے رہی تھی۔

مزید ٹیکس اس درمیان میں ملک کی اقتصادی حالت بہت خراب ہوگئی تھی۔ جس کا سب سے زیادہ اثر زراعت پیشہ طبقہ پر غلے کی ارزانی کی وجہ سے پڑا اور ہر مقام پر گورنمنٹ کو گھاٹے کا سامنا کرنا نظر آرہا تھا۔ اس گھاٹے سے بچنے کی صرف یہ ترکیب تھی کہ نئے ٹیکس لگائے جائیں۔ یہ نئے ٹیکس مُردہ پر سو دُرّے کی طرح تھے اس لئے کہ پہلے ہی سے لوگوں کی حالت سقیم تھی اور ان میں کسی مزید ٹیکس کی تاب باقی نہ تھی۔ گورنمنٹ کو مالی مشکلات کا بیشک سامنا تھا مگر لوگوں کی حالت بھی ابتر تھی۔ خیال تو یہ تھا کہ گورنمنٹ کفایت شعاری سے کام لیکر کام کالے گی اور سب سے بڑی مالیات کے ماہر و مدبر گلیڈ اسٹون کے مشہور مقولہ سے سبق لے گی کہ "کفایت شعاری خود مال کا ذریعہ ہے" اگر کفایت شعاری سے کام لیا گیا ہوتا تو کافی سرمایہ اور دیگر مفید و کارآمد کاموں کے لئے نکل سکتا۔ مگر چونکہ ہماری سرکار

نہ تو قومی ہے اور نہ ذمہ دار ہے اسے ہمدردی اور ذمہ داری کا احساس کہاں۔ اسے وہی پرانی ترکیب ٹیکس بڑھانے کی معلوم ہے جو چلتے ہوئے جادو اور ہر مرض کی دوا درود شریف کی طرح کام میں لائی جاتی ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مقام پر سڈنی اسمتھ کا ایک اقتباس پیش کیا جائے جو آج سے سو برس سے زیادہ ہوئے لکھا گیا تھا اور جس میں انگلینڈ کے اُس زمانے کے ٹیکس کا ذکر ہے۔ یہ ٹکڑا ہندوستان پر بھی چسپاں ہوتا ہے۔

"ہر چیز پر ٹیکس جو مُنہ میں جائے یا جسم پر رہے یا پیر میں پہنی جائے۔ جو چیز دیکھنے۔ سُننے۔ احساس کرنے۔ سونگھنے یا چکھنے میں اچھی معلوم ہو سب پر ٹیکس۔ گرمی۔ روشنی اور ہوا پر ٹیکس۔ جو چیزیں زمین پر ہیں یا زمین کے اندر پانی پر ہیں۔ جو باہر سے آویں یا جو گھر میں پیدا ہوں ان پر ٹیکس۔ عام پیداوار پر ٹیکس اور جو چیزیں صاف کر کے درست اور خوبصورت بنائی جائیں ان پر ٹیکس۔ چٹنی۔ مربے۔ اچار پر جس سے انسان کو بھوک لگے دوائیں جو صحت بخش ہوں ان پر ٹیکس۔ ججوں کے گون پر اور ملزم کی پھانسی کی رسّی پر ٹیکس۔ غریبوں کے نمک اور امیروں کے مسالے پر ٹیکس۔ کفن کے جڑنے کے پیتل پر اور عروس کی آرائش کی جھالر اور فیتے پر ٹیکس۔ گھر میں سوئے تو ٹیکس دے۔ سفر کرے تو ٹیکس دے۔ اچھا ہو تو ٹیکس دے۔ بیمار پڑو تو ٹیکس دو۔ اسکول کا طالب علم اپنی ٹیکس لگی ٹوپی اچھال رہا ہے اور نوجوان ٹیکس لگی ہوئی لگام کو تھامے ہے اور ٹیکس لگی ہوئی سڑک پر جا رہا ہے اور قریب المرگ انگریز اس دوا کو جس پر ۷ فی صدی ٹیکس لگا ہے ۱۵ فی صدی ٹیکس لگے ہوئے چمچے میں لے کر ۲۲ فی صدی ٹیکس لگے ہوئے بستر پر دواساز کی گود میں جسے ۱۰۰ پونڈ ٹیکس ادا کر کے یہ شرف نصیب ہوا۔ مرنے کے لئے تیار ہے۔ اب تو اس مُردے کی تمام جائداد پر ۲ فیصدی سے

۱۰ فی صدی کا ٹیکس ہے - وصیت نامہ کی فیس کے علاوہ ایک بڑا ٹیکس دفن ہونے کا بھی ادا کیا جانا ضروری ہے - دفن کے بعد اس کی خصوصیات ٹیکس شدہ سنگ مرمر پر لکھے جائیں گے اور وہ مٹی میں مل کر خاک ہو جاوے گا تاکہ ٹیکس سے چھٹکارا ملے"!

عدم ادائگی لگان کی تحریک

ممالک متحدہ میں مدراس کی طرح رعیت واری طریقۂ ادائگی مالگذاری کا نہیں ہے بلکہ یہاں زمینداری ہے - کاشتکاروں کی فلاح کے لئے گورنمنٹ نے اعلان کرنے میں مہلک تاخیر سے کام لیا - اعلان جو ہوا بھی وہ خاطر خواہ نہ تھا - بلکہ انتہائی درجہ نامناسب اور ناکافی نکلا - کانگریسیوں نے گاندھی - اِروِن پیکٹ کو پسند نہ کیا تھا ایک کے بارے میں تو یہ کہا جاتا ہے کہ اس پر انھیں بہت رقت آئی اور خوب روئے۔ بہرحال کانگریسیوں نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور عدم ادائگی لگان کی تحریک شروع کردی - سر مالکم ہیلی کی ولایت کی واپسی پر صوبہ متحدہ کی گورنمنٹ نے اپنی تعویق کا پورے طور سے احساس کرکے زمینداروں اور کاشتکاروں دونوں کے لئے کافی چھوٹ مقرر کی اور کافی فراخ حوصلگی سے کام لیا - مگر صوبہ متحدہ کی کانگریس کمیٹی نے لڑنے پر غلطی سے کمر باندھ رکھی تھی اور ملک کی بدقسمتی تھی کہ کانگریس کی مجلس منتظمہ نے اسے منظور کرلیا تھا - عدم ادائگی لگان کی تحریک مہاتما گاندھی کی عدم موجودگی میں شروع ہوگئی تھی جنھیں اپنی واپسی پر ایک جانب عدم ادائگی لگان کی تحریک سے اور دوسری جانب آرڈیننس (وقتی قوانین) سے دوچار ہونا پڑا - صوبہ بنگال اور صوبہ سرحد کے لئے آرڈیننس تھے اور ایک تو خاصکر عدم ادائگی لگان کے متعلق صوبہ متحدہ میں جاری تھا - مہاتما گاندھی نے معاملات کے سلجھانے کی غرض سے وائسرائے سے ملنے کی بہت کوشش کی مگر شومی قسمت تھی کہ وائسرائے نے بنگال اور سرحدی صوبوں کی آرڈیننس کے متعلق گفتگو کرنے سے قطعی انکار کردیا - اور

تھوڑے ہی دنوں بعد مہاتما گاندھی۔ مسٹر ولبھ بھائی پٹیل اور چند دیگر لیڈر اُسی پُرانے رگولیشن (قانون) کے تحت میں بغیر کسی روبکاری اور الزام اور پیشی کے گرفتار کر لئے گئے۔ پنڈت جواہر لال نہرو مہاتما گاندھی سے ملنے بمبئی جا رہے تھے وہ بھی راستہ میں گرفتار کر لئے گئے۔

سول نافرمانی دوسری بار

ابکی بار کا کیا پوچھنا تھا۔ بارود تیار تھی صرف چنگاری کی ضرورت رہ گئی تھی وہ بھی پوری ہو گئی عام عدم ادائگی لگان کے شعلے بھڑک اُٹھے اور ملک میں ایک آگ سی لگ گئی۔ گورنمنٹ کی جانب سے اسے فرو کرنے میں ستعدی سے کام لیا گیا۔ متعدد اقسام کے ارڈننیس پہلے ہی سے تیار تھے جو یکے بعد دیگرے برابر نافذ کر دئے گئے۔ خیال تھا کہ ابکی بار کی تحریک پہلی سے بھی جلد ختم ہو جائے گی۔ مگر ایسا نہ تھا۔ ملک کی پریشان حالی۔ لوگوں کی بے سروسامانی۔ گورنمنٹ کی جانب سے بدظنی اور بے اطمینانی حد درجہ پر پہلے سے پہونچی ہوئی تھی۔ پھر کیا تھا بالکل خلاف امید ہزارہا نے کانگریس کی آواز پر لبیک کہی اور جیل جانے اور بعد کے نتائج کے لئے جوق کے جوق نکل پڑے ایک طرف گورنمنٹ سختی پر تُلی تھی دوسری طرف کانگریس بھی نہ جھک رہی تھی۔ حالت یہ تھی کہ کانگریسی ہونا جیل جانے کے لئے مرادف تھا۔ تقریبًا ہر لیڈر گرفتار ہو کر تحریک سے علیحدہ کر لیا گیا مگر تحریک ویسی کی ویسی ہی رہی۔ پولیس کی زیادتیاں تو ۱۹۳۰ء ہی سی رہیں مگر اس کی کوئی سماعت کوئی داد رسی نہ ہوئی۔ اور غیر عہدہ دار انگریزوں نے جو ان سختیوں۔ ان زیادتیوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی اس کی بھی سماعت نہ ہوئی۔ آخر کار تحریک دبادی گئی بلکہ کچل دی گئی۔ کانگریس کا تو یہ دعویٰ تھا کہ برطانوی عملداری ہم نہ رہنے دیں گے اور اسی دعوے پر گورنمنٹ نے یہ زور دکھایا ہاں اس کا بھی خیال رہے کہ فریقین میں برابر کا مقابلہ

نہ تھا۔ لڑائی بے جوڑ تھی۔ سنہ ۱۹۳۰ء میں گورنمنٹ اور کانگریس کے درمیان مفاہمت اور مصالحت کی کوششیں کی گئی تھیں۔ اس کی ناکامی کی ذمہ داری لیڈروں کے سر ہے ورنہ اس میں کوئی کلام نہیں کہ لارڈ اروِن نے سمجھوتے کے لئے اپنی دلی خواہش ضرور ظاہر کی تھی۔ سنہ ۱۹۳۱ء میں ہر کوشش بے سود تھی۔ پہلی بار مسٹر ویج اوڈ بین وزیر ہند تھے اور سنہ ۱۹۳۲ء میں سر سیموئل ہور مسند وزارت پر جلوہ گر تھے جنھوں نے پکار کر کہہ دیا تھا کہ وہ تحریک کا خاتمہ جس بیخ و بُن طور سے ہو سکے گا کر کے چھوڑیں گے۔ ان کو مفاہمت و مصالحت کا وہم و گمان بھی نہ ہوتا۔ سنہ ۱۹۳۳ء میں تحریک دبی اور دبائی گئی اور سنہ ۱۹۳۴ء میں تو کانگریس نے خود اسے روک دیا۔

فرقہ وارانہ فیصلہ (award) اگست سنہ ۱۹۳۲ء میں وزیر اعظم کا فیصلہ جسے فرقہ وارانہ فیصلہ کہتے ہیں شایع ہوا۔ ہندوؤں کیلئے خصوصاً بنگال و پنجاب کے ہندوؤں کیلئے جو کم تعداد میں ہیں فیصلہ مضر تھا۔ اسکے روسے نیچ ذاتوں کے لئے جُداگانہ انتخاب طے ہوا تھا جس پر مہاتما گاندھی اس قدر ناراض ہوئے کہ آپ نے یار وادا جیل میں مسلسل روزے شروع کر دئے۔

میثاق پونا یہاں قوم کے لیڈر جمع ہوئے کہ سانحہ عظیم (گاندھی جی کی موت) کہیں نہ ہو جائے اور اس کے روکنے کی غرض سے ان لوگوں نے نیچ قوم سے مصالحت کی۔ اس مصالحت کی رو سے جداگانہ انتخاب کا خاتمہ تو نہیں ہوا البتہ اس قدر اشک شوئی ضرور ہوئی کہ ان دونوں کو گورنمنٹ کے فیصلہ سے زائد جگہیں مل گئیں۔ فرقہ وارانہ فیصلہ سے ہندو قوم نقصان میں ہے خصوصاً بنگال میں جہاں گورنمنٹ نے یوروپین کو ہندو و مسلمان کے مقابلہ میں بلحاظ تناسب زیادہ جگہیں دیدی ہیں اور ہندو لیڈروں نے پونا میں جمع ہو کر نیچ ذاتوں کو اور زیادہ جگہیں دیدیں۔ میثاق پونا کی تائید میں صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ مہاتما جی کی جان بچانے کے لئے

کیا گیا ورنہ کوئی اور مناسب بات نہیں کہی جاسکتی۔

اتحاد کانفرنس

پنچ ذاتوں کی معاملہ فہمی اور صلح کے بعد ہی پنڈت مدن موہن مالوی نے اپنی اس امید افزا بلند ہمتی کے ساتھ جو واقعات کو بیشتر پیش نظر رکھتے ہوئے الہ آباد میں اتحاد کانفرنس منعقد کی جس کی صدارت سالم کے آزمودہ کار لیڈر مسٹر وجوار اگھوا چاریہ نے کی اور جس میں مختلف جماعتوں کے نمائندے بکثرت شریک ہوئے۔ مگر پوری صلح نہ ہوسکی۔ بہت سی باتیں طے ہوگئیں اور کانفرنس کی کمیٹی بنگال کے معاملات کو مقامی طور پر طے کرنے کے لئے روانہ ہوئی۔ دو باتیں یعنے۔ برطانوی ہند کے مسلمانوں کو مرکزی مجلس قانون ساز میں ۳۲ جگہیں دی جاویں اور سندھ کو گورنر کا صوبہ ہندوؤں کے تحفظ حقوق کا لحاظ رکھتے ہوئے بنایا جائے اور اس صوبہ کو مرکزی مالیہ سے امداد نہ ملے طے پاچکی تھیں۔ مگر بدقسمتی دیکھئے کہ یہ باتیں عام طور پر مشہور ہوگئیں اور جبکہ کمیٹی کلکتہ میں ہو رہی تھی ٹھیک اُسی وقت سر سیموئل ہور نے لندن میں اعلان کر دیا کہ ملک معظم کی گورنمنٹ نے یہ طے کر دیا ہے کہ مسلمانوں کو مرکزی مجلس قانون ساز میں ۳۳ ۱/۳ جگہیں دی جاویں اور صوبۂ سندھ کو علیحدہ کر دیا جاوے جسے مرکزی مالیہ سے امداد بھی ملے گی اور ہندوؤں کے تحفظ کی کوئی خاص شرط نہیں مقرر کی جاوے گی۔ اب کیا تھا چونکہ مسلمانوں کے مطالبات پورے ہوچکے تھے کمیٹی برخاست ہوگئی اور کل دوڑ دھوپ بے کار ہوگئی۔

تیسری راؤنڈ ٹیبل کانفرنس

۱۹۳۲ء میں تیسری راؤنڈ ٹیبل کانفرنس لندن میں ہوئی جس میں تاخیر پسند جماعت زیادہ نمودار تھی۔ اس کے پہلے جو دو کانفرنسیں ہوچکی تھیں ان میں سے ایسے ممبر جن کے متعلق یہ خیال کیا جاچکا تھا کہ وہ گورنمنٹ کے چشم و ابرو کے اشارے پر

نہیں چل سکتے اس کانفرنس میں نہیں لئے گئے۔ یہاں تک کہ سر سیموئل ہور نے سرینواس شاستری کو بھی نہیں شریک کیا۔ اس کانفرنس کا نتیجہ پہلے ہی سے ظاہر تھا۔ میں نے یہ پہلے تبلادیا ہے کہ کس ذہنیت نے اس وقت زور پکڑ رکھا تھا اور وہ کون سی وجہ تھی جس نے غیر سرکاری طریقہ پر ہندو مسلم اتحاد کو ہونے نہ دیا تھا۔ بہرحال اس سے ایک سال قبل وزیر اعظم برطانیہ کے سامنے اقلیتوں کا میثاق پیش کرکے زہر بویا جانا شروع ہو گیا تھا۔ سر ایڈورڈ بنتھل نے ایک خط چھاپ کر بہت سی خفیہ ریشہ دوانیوں کو ظاہر کر دیا تھا۔ غالباً وہ خط کلکتہ کی رایلسٹ (ROYALIST) جماعت کو خفیہ بھیجا گیا تھا مگر اخبارات میں آجانے کے بعد لکھنے والے کو کافی خفت ہوئی اور پبلک کو باتیں معلوم ہو گئیں۔

قرطاس ابیض

(سفید کاغذ) ملک معظم کی گورنمنٹ نے مارچ ۱۹۳۳ء میں نئے دستور کی ترتیب و تعمیر کا خاکہ چھاپا جسے قرطاس ابیض کی صورت میں پیش کیا۔ یہ قرطاس ابیض اس قدر رجعت پسند تھا کہ ہندوستان کی کوئی ترقی پسند جماعت اس سے اتفاق نہ کر سکتی تھی۔ ہندوستان بھر کے تقریباً ہر قائد نے اس کو سخت سے سخت الفاظ میں برا کہا اور راؤنڈ ٹیبل کمیٹی کے سفارشات میں اور اس کے سفارشات میں کوئی دور کا بھی تعلق نہ دکھائی دیتا۔ لارڈ ارون نے جولائی سنہ ۱۹۳۰ء میں مرکزی مجالس قانون ساز کو جمع کرکے فرمایا تھا "ملک معظم کی گورنمنٹ کا خیال واثق ہے کہ کانفرنس کے ذریعے سے ایسے انکشافات ہوں جنھیں دونوں ممالک اور سب جمعیتیں اور پارٹیاں عزت کے ساتھ قبول کر سکیں۔ کوئی ایسا میثاق یا اتفاق آرا جسے کانفرنس طے کرے گی وہی ملک معظم کی گورنمنٹ کی اُن سفارشات کی بنیاد اور اساس قرار دی جائے گی جو پارلیامنٹ کے روبرو پیش ہوں گے۔ ملک معظم کی گورنمنٹ اس کانفرنس کو محض بحث و مباحث کی جماعت

نہیں تصور کرتی بلکہ اسے دونوں ممالک کے نمائندوں کی ایسی جماعت قرار دیتی ہے جن کی اتفاق رائے کو پارلیامنٹ کے سامنے صاف صاف سفارش کرنے کی بنیاد قرار دے سکے۔

جوائنٹ سلکٹ کمیٹی رپورٹ

گورنمنٹ کے تو ڈھنگ ہی نرالے ہیں۔ اپنا کام کرنے کے اُس نے نئے طریقے نکالے۔ اگر تینوں راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے ہندوستانی ممبروں کی رائے کی یہی وقعت کرنی تھی تو یہ کانفرنسیں کیوں کی گئی تھیں! قرطاس ابیض نے تو تمام ہندوستانیوں کی بڑی بڑی امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ دارالعوام و دارالخواص دونوں کی متفقہ کمیٹی کے سپرد اس کے جانچنے کا کام کیا گیا اور گواہوں کی شہادت کے وقت چند ہندوستانی بھی کمیٹی کے معین مقرر کئے گئے جن کا کام کمیٹی میں کوئی خاص حصہ لینا قرار نہیں دیا گیا بس نام کے معین تھے۔ اس کمیٹی کے سامنے دو عرضداشتیں پیش ہوئیں۔ ایک تمام برطانوی ہند کے مندوبین کی جانب سے تھی جو ہز ہائینس آغا خاں کی قیادت میں پیش ہوئی اور دوسری سر تیج بہادر سپرو نے پیش کی۔ ان عرضداشتوں میں بہت زیادہ مطالبہ نہ تھا پھر بھی ان کا کوئی خیال نہیں کیا گیا اور دیوانوں کی باتوں (بڑ) سے زیادہ اس پر توجہ نہیں کی گئی۔ قرطاس ابیض کی سفارشات کو بس یہ خیال کرو کہ نقطے اور شوشے درست کر کے کمیٹی کی اکثریت نے جوں کی توں سفارش کردی۔ ہاں تبدیلیاں وہاں ضرور کی گئیں جہاں بد سے بدتر ہو سکتا تھا اور اس بد سے بدتر کی ایک مثال تو مرکزی مجلس قانون ساز کا غیر مستقیم الکشن ہے جس پر جس قدر زیادہ اعتراض کیا جائے کم ہے۔ اس رپورٹ پر تمام ملک نے اپنی عدم نامنظوری کی بوچھار برسائی اور ہر اس انجمن نے جو فرقہ وارانہ خانہ جنگی کو مردود قرار دیتی ہے اور جو رجعت پسندی کو اصلاح نہیں

قرار دیتی ہے اس سے اپنا پورا اختلاف ظاہر کر دیا۔

ہمیں یہ نہیں خیال کرنا چاہیے کہ اتنی بڑی اسکیم میں کچھ اچھی باتیں نہ ہوں گی۔ بہت سی ایسی بھی ہیں پھر بھی ہمیں تو اس کی پوری پوری جانچ پڑتال کر کے یہ دیکھنا ہے کہ اس کے تحت میں کیا ملتا ہے اور کیا باقی رہتا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے جب دیکھا جائے تو صاف ظاہر ہوگا کہ باقی رہنے کا پلّہ بھاری ہے اور مرکزی حکومت میں تو صاف گھاٹا ہے۔ یہ نام نہاد اصلاحات کو آئینی ترقی کے نام سے موسوم کرنا سیاسی جرم ہے اور اسے مردود قرار دینا سیاسی فرض۔ یہی وہ بات ہے جس پر کانگریسی۔ لبرل اور دیگر محب وطن جماعتیں پورا پورا اتفاق کرتی ہیں۔ اور سب کی سب ہم آواز ہیں۔

نیا گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ

انگلستان کی رجعت پسند گورنمنٹ کو کیا پڑی تھی کہ وہ ہندوستان کی رائے کو سنتی۔ اس نے اپنی جماعت کے ان سخت جان رجعت پسندوں کو خوش کرنا اپنا فرض قرار دیا جو ہندوستان کے درپئے آزار رہتے ہیں اور جنھیں ہندوستان کے نقصان سے خوشی ہوتی ہے۔ اس کا نتیجہ موجودہ سال کا گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ہے۔ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ ہم ہندوستانیوں میں فرقہ وارانہ وہ پھوٹ ہے جس کی وجہ سے ہم کوئی متفقہ کارگر احتجاج اس ظلم کے خلاف نہیں کر سکتے۔ یہ آپس کا نفاق۔ یہ فرقہ وارانہ جد و جہد اور یہ خانہ جنگیاں جو ہماری بدقسمتی سے ہمارے ملک میں برپا ہیں۔ ہم سے کہیں کم تعداد کی قوموں میں نہیں ہیں جو اپنے اظہار خیال کے لئے ہم سے کہیں آگے ہیں اور جو اپنے مطالبات میں ہم سے زیادہ کامیاب ہیں۔

آل انڈیا (پورے ہندوستان کے) فیڈریشن کا ہم ہمیشہ خیر مقدم کرنے کو تیار ہیں۔ فیڈرل (وفاقی) دستور اساسی خصوصاً مرکزی حکومت میں ایک

مناسب آئین ہے۔ صوبوں میں ڈائی آر کی گورنمنٹ کو ختم کر دینا بیشک ایک خاطر خواہ بات ہے اور ووٹروں کی تعداد میں اضافہ بھی ایک پسندیدہ شئے ہے۔ اس کے بعد موجودہ دستور اساسی کی خوبیاں گویا ختم ہیں۔ جس طرح کا فیڈریشن ایک دن آنے والا ہے وہ کون سا فیڈریشن ہے صرف فیڈریشن نام کو ہے۔ ذرا لطف تو دیکھئے کہ ریاستوں کے جو نمائندے فیڈرل اسمبلی (وفاقی مجلس قانون ساز) میں نامزد ہو کر آئیں گے وہ برطانوی ہند کے معاملات پر رائے زنی کر سکیں گے۔ مگر برطانوی ہند کے نمائندوں کو ہرگز یہ اختیار نہ ہوگا کہ وہ دیسی ریاستوں کے معاملات میں کسی قسم کی رائے دے سکیں۔ ان کو ریاستوں کے معاملات میں چوں کرنے کا بھی حق حاصل نہ ہوگا۔ ریاستوں کی حالت قابل دید ہے کہ انھیں اپنی برطانوی گورنمنٹ کی عظمت اور اس کی جلالت ہر وقت تسلیم ہے مگر نہ اپنی رعایا پر اعتماد ہے اور نہ اپنے اہل وطن یعنے برطانوی ہند کے باشندوں پر بھروسہ ہے۔ ریاستوں کی رعایا کو موجودہ حالت کے مقابلہ میں کوئی زائد سیاسی حقوق بھی حاصل نہ ہوں گے۔ دیسی ریاستوں کی ایک بڑی اکثریت کو کوئی حق حاصل نہیں ہے اور جیسا کہ میں نے پہلے بتایا ہے۔ فیڈرل مجلس قانون ساز میں اُن کی نمائندگی بھی نہ ہوگی۔ برطانوی گورنمنٹ نے گورنر جنرل اور گورنروں کے ذریعہ سے تقریبًا ہر اختیار کو قائم رکھا ہے جس سے برطانیہ کی ہر آرزو اور مقصد پورا ہوتا رہے گا۔ نئی گورنمنٹ کے لئے ملک کی حفاظت کا مسئلہ بیرون اختیار ہے جس پر نئی گورنمنٹ کو رائے دینے کا بھی حق حاصل نہیں ہے۔ آئندہ کا وزیر مالیہ نئے ٹیکس کے ذریعہ سے مالگذاری میں اضافہ کر سکے گا مگر اُس کی بیچارگی دیکھو کہ اس اضافہ شدہ رقم کو صرف کرنے کا یا یہ بتانے کا کہ یہ کس طرح صرف ہو اُسے حق نہ حاصل ہوگا۔ عملی طور پر اس وزیر کا عدم اور وجود برابر ہوگا۔

آئندہ کی گورنمنٹ اور مجالس قوانین ساز کو ہندوستانی صنعت وحرفت کے تحفظ کا پورا اختیار نہ حاصل ہوگا اس لئے کہ اُن کے لئے حدود مقرر کردئے گئے ہیں جو سراسر برطانوی فوائد کو مدِنظر رکھ کر بنائے گئے ہیں۔

Law & crder. نظم وقانون بیشک وزرا کے ہاتھوں میں ہوگا مگر گورنروں اور گورنر جنرل کو ان کے بارے میں جو ذاتی رائے کا اختیار حاصل ہے اس سے سب لیکھا ڈیوڑھا برابر ہوا جاتا ہے۔ آل انڈیا ملازمتیں جُوں کی تُوں سکریٹری ہند کی خاص نگرانی میں رہیں گی۔ ہند کے سکریٹری کو ان ملازمتوں میں بھرتی کا حق ہوگا اور آئی، سی، ایس۔ آئی، پی۔ آئی، ایم، ایس و نیز دیگر آل انڈیا ملازمتوں کے عہدہ دار اپنی موجودہ عظمت پر قائم رہیں گے اور اگر ان میں سے کوئی چاہے گا تو کافی طور پر مداخلت کرنے والے وزرا کو پریشان کرسکے گا۔ علاوہ بریں انتخاب جداگانہ قائم رہے گا جس سے آپس کی پھوٹ اور نفاق بڑھنے کا شدید اندیشہ ہے۔

اس پر سے سکنڈ چیمبر (دوسری کاونسل) کا قیام بیشتر صوبوں میں بھی خاص اہمیت رکھتا ہے پنجاب کو یہ نعمت نہیں حاصل ہوئی جس کی وجہ میری رائے میں وہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ کیلون کے لارڈ رسل نے انگلستان کے ہاؤس آف لارڈس (دارالخواص یعنے) دارالامرا کے بارے میں کہا ہے "کہ یہ ہر بہتری کا پرانا دشمن ہے" ہمارا دارالامرا جو شملہ اور دہلی میں ہے (یعنے کاونسل آف اسٹیٹ) نے بھی اپنے پندرہ سالہ قیام میں تقریبًا یہی نام پیدا کیا ہے اور صوبوں میں جو کاونسل نمبر ۲ قائم ہو رہی ہے خیال ہے کہ ایسی ہی کارگذاریاں کرے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ یہ کاونسل ترقی افزا دیہی قوانین میں رکاوٹیں پیدا کرے گی جس کی وجہ سے غیر اصولی کام کرنے والوں کو ایک اور بہانہ مل جائے گا۔ یہ امر بھی قابل غور ہے کہ اس ایکٹ کی رو سے برہما اور (عدن) ہندوستان سے علٰحدہ

ہوئے جاتے ہیں اگر کوئی ہندوستانی اس اسکیم کا دلدادہ ہے تو میں یقین دلاتا ہوں کہ مجھے اس پر رشک نہیں آتا۔ بہت ممکن ہے کوئی ہندوستانی ایسا بھی ہو۔ مگر مجھے امید بہت کم ہے۔ شاید ہی کوئی اس طبیعت کا ہوگا۔

بنگال میں دہشتناکی کی وبا

دہشتناکی کی وبا جو ۲۰ برس پہلے تقسیم بنگال کے وقت شروع ہوئی تھی آج بھی موجود ہے گورنمنٹ نے اس کی بیخکنی کے لئے کوئی دقیقہ جیسا کہ گورنمنٹ کا فرض ہونا چاہئے اٹھا نہیں رکھا مگر اُسے خاطر خواہ کامیابی اب تک نہیں ہوئی۔ غلطی یہ ہوئی کہ گورنمنٹ نے اسے سختی اور زبردستی سے دبانا چاہا۔ کچھ ایسے سخت قوانین اور سخت انتظامی طریقے گورنمنٹ نے اس کے دبانے اور دفع کرنے کے لئے اختیار کئے جس سے گیہوں کے ساتھ گھُن بھی پس گئے یعنے بہت سے بے گناہ بھی ان قوانین کی زد میں آگئے اور بعض اوقات تو ایسے طریقے برتے گئے جن سے وفادار اور قانون کی عزت کرنیوالی رعایا کو تکالیف کا سامنا ہوا۔

یہ امر مسلمہ ہے کہ جب کوئی بے گناہ شخص ملزم قرار دیا جائے گا تو بدگمانی ترقی کرے گی۔ گورنمنٹ کو چاہئے تھا کہ اپنے طریقے اور قوانین کے نفاذ کے لئے عام طبقہ کی ہمدردی حاصل کئے ہوتی۔ کون ایسا ہے جو دہشتناکی کی وبا کو قائم رکھنا چاہتا ہے اور میری تو رائے ہے کہ ان دہشتناکی والے افراد میں سے شاید ہی کوئی ایسا ہو جو اس مذموم و مردود طریقے کو ترک کرکے عزت کی زندگی اگر اسے مل سکے بسر کرنا نہ چاہتا ہو۔ مگر حکام نے اپنے اختیارات کے زعم میں سرشار ہوکر پبلک ہمدردی حاصل کرنے کا کچھ خیال نہ کیا اور نہ پبلک کے ذریعہ سے کوئی کام اس کے دبانے کے لئے لیا اور ایسے طریقے اختیار کئے جن سے انسانی ہمدردی اور انسانیت کو نفرت سی پیدا ہوگئی۔ عام پبلک اس کے لئے تیار ہے کہ گورنمنٹ

اس کی رائے اور امداد سے فائدہ اٹھائے مگر گورنمنٹ نے خود اس کی جانب کوئی توجہ نہیں کی۔ انگریز حکام نے تاریخ کے مشہور سبق سے فائدہ نہیں اٹھایا کہ قانون کو رائے عامہ کی اشد ضرورت ہے اور یہ سلطنت کے اصول کے قطعی خلاف ہے کہ عام ہمدردی حاصل نہ کی جائے۔

ایک اور نکتہ قابل لحاظ ہے وہ یہ کہ اس دہشتناکی کی وبا کا ایک اور پہلو ہے یعنے پڑھے لکھے نوجوانوں کو بسر اوقات کے لئے کوئی معقول ذریعہ نہ ہونا اور ان کی بے روزگاری کا پہلو جس کا تعلق معیشتی حیثیت رکھتا ہے۔ پڑھے لکھے نوجوانوں کی بے روزگاری کے مسئلہ پر بنگال ڈسٹرکٹ ایڈمنسٹریٹیو کمیٹی نے خاص طور پر زور دیا تھا جس کی صدارت سردار نی لوٹ۔ کے، سی، یس، آئی۔ آئی، سی، یس نے کی تھی اور بہت سے مناسب و آشتی پسند طریقے تجویز کئے تھے۔ مگر افسوس ہے کہ بنگال گورنمنٹ نے کسی تجویز پر عمل نہیں کیا اور ابھی چند ہفتہ قبل گورنمنٹ بنگال نے چند آئینی کام کا اس سلسلہ میں خیال کیا ہے جس کا نتیجہ خود زمانہ پیش کرے گا۔ مجھے تو بہت اچھی امیدیں ہیں۔ بنگال ایڈمنسٹریٹیو رپورٹ ۱۹۳۲ء کے صفحات میں ایک جملہ ہے جسے ہر قومی اخبار میں خاص جگہ ملنی چاہئے تھی "دہشتناکی کی بیخکنی بنگال میں نہیں ہوئی اور بیخکنی محض قانون کے ذریعہ سے ہرگز نہیں ہوسکتی" کیا یہ امید کی جائے کہ بنگال کا ہر گورنر اسے اپنے دل پر نقش کرے گا۔ کیا اس کی امید کی جائے کہ دوسرے گورنر اور وائسرائے بھی اسے یاد رکھیں گے۔

بے روزگاری

بے روزگاری کی بلا صرف بنگال ہی تک محدود نہیں ہے۔ مغربی ممالک میں مزدور پیشہ جماعت کی بے روزگاری نے ایک نہایت ہی اہم سیاسی مسئلہ کی حیثیت اختیار کرلی ہے۔ ہندوستان میں زراعت پیشہ طبقہ کو ہر سال کئی ماہ تک بے روزگاری کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ غیر ممالک کے

مالوں کی درآمد اور خود ہندوستان میں صنعت وحرفت کی یک گونہ ترقی سے دیہاتی طبقہ کو ان کے معمولی اور چھوٹے موٹے صنعتی کاموں میں رکاوٹیں حائل ہو رہی ہیں۔ مگر اس بات کو دیکھ کر بھی سوائے افسوس ظاہر کرنے کے اسے دفع کرنے کی کوئی عملی ترکیب نہیں کی جا رہی ہے۔ تعلیم یافتہ طبقہ کی بے روزگاری نے تو وہ زور پکڑا ہے کہ بذات خود ایک اہم قومی مسئلہ بن گئی ہے۔ اس امر پر مختلف بار یکہ وکہ طور پر غور کیا گیا مگر کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ اس وقت دو کمیٹیاں بے روزگاری کے متعلق مشغول کار ہیں۔ ایک ہمارے صوبے میں اور دوسری بہار میں۔ ہمارے صوبے کی کمیٹی کے صدر سر تیج بہادر سپرو صاحب ہیں جن کے بارے میں میں خود جانتا ہوں کہ موصوف نہایت دلسوزی و محنت اور انہماک کے ساتھ مشغول کار ہیں۔ اس کمیٹی کی رپورٹ چند ہفتوں کے اندر چھپ کر پبلک کے ہاتھوں میں پہونچ جائیگی مگر سفارشات کو عملی جامہ پہنانا تو گورنمنٹ کا کام ہوگا۔ (رپورٹ مذکور اس درمیان میں شائع ہو چکی ہے جن میں مسئلہ بے روزگاری پر نہایت مبسوط و معنی خیز بحث کی گئی ہے۔ اس طرح کی رپورٹ ہندوستان میں اب تک شائع نہیں ہوئی تھی اور میں اسے نہایت خوشی کے ساتھ کہتا ہوں کہ گورنمنٹ صوبہ اپنے مالیات کا خیال کرتے ہوئے کمیٹی مذکور کی سفارشات کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کر رہی ہے۔ گورنمنٹ ہند بھی لارڈ لنلتھگو کی قیادت میں اس کمیٹی کی رپورٹ پر خاص غور کر رہے ہیں) ایک بات ضرور ہے اگر گورنمنٹ آئینی طریقوں پر روپیہ نہیں صرف کرنے کو تیار ہے تو کمیٹی اور رپورٹوں کی تعداد بالکل بیکار بات ہے۔ مہاتما گاندھی کی ویج انڈسٹریز ایسوسی ایشن (انجمن معین صنعت وحرفت دیہ) نے گورنمنٹ کو دیہات سدھار کی طرف متوجہ کیا ہے اور خود موجودہ وائسرائے کو اس سے خاص دلچسپی ہے نتیجہ بیشک آگے چل کر ظاہر ہوگا۔

مطابع (صحافت نگاری) اس زمانے میں صحافت نے باوجود ان دقتوں کے جو گورنمنٹ کی جانب سے پیدا ہوتی رہیں کافی ترقی کی۔ صوبہ مدراس میں "اندھرا پترکا" ہے جو مسٹر کے نگیسوراراؤ ایسے سخی اور محب وطن کا ممنون احسان ہے۔ اس اخبار نے اندھرا دیس کی اسی طرح خدمت کی ہے جس طرح کہ "سودیشی متران نے تامل آبادی کی خدمات انجام دی ہیں "ہندو" نے بہت زیادہ ترقی کی اور ہندوستان کے مشہور ترین اخبارات میں شمار کیا جاتا ہے۔ مسٹر کستوری رنگا ایر کے بعد اس کے اڈیٹر مسٹر اے۔ رنگا سوامی ایر ہوئے جو اپنی آئینی و مالی معلومات کی وجہ سے شہرہ آفاق تھے۔ ان کی قبل از وقت موت سے ہندوستان کی سیاسی و صحافتی زندگی کو سخت نقصان پہونچا "جسٹس" اپنی ہمنام پارٹی کے حقوق کا تحفظ پوری طرح سے کر رہا ہے۔ صوبہ مدراس میں دیگر روز نامے "سوراجیہ" اور "انڈین ایکسپریس" ہیں۔

بمبئی کے مسٹر جہانگیر پٹیت نے "انڈین ڈیلی میل" پر لاکھوں روپے صرف کر ڈالے مگر یہ اخبار نہ چلا۔ پونا کا "دنیان پرکاش کو" جو ایک مرہٹی اخبار ہے مسٹر گوکھلے نے اپنے ہاتھوں میں لے لیا تھا جو اب تک مفید و کارآمد کام سرونٹ آف انڈیا سوسائٹی کا برابر کر رہا ہے۔ اسی انجمن کا ہفتہ وار اخبار "سرونٹ آف انڈیا" ہے جس کے پہلے اڈیٹر خود مسٹر سرینواس شاستری ہوئے تھے۔ ان کے بعد مسٹر ایس، جی، وازے اور مسٹر پی، کوڈنڈا نے اس اخبار کے ذریعے سے نہایت نمایاں پبلک خدمات برابر انجام دیتے رہے۔ مسٹر ہارنیمین ہندوستانی صحافت کے میدان میں دوبارہ واپس ہوکر "بمبئی سنٹنل" نکال رہے ہیں۔ صوبہ بنگال میں سریندر ناتھ بنرجی کا "بنگالی" "ہندو پیٹریٹ" اور "انڈین میرر" کی طرح ختم ہوگیا مگر "امرت بازار پترکا" اپنی اُسی آب و تاب سے جاری ہے اس دوران میں

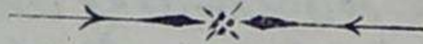
اس کے مشہور ترین اڈیٹر مسٹر موتی لال گھوش کا انتقال ہوگیا اور اسی زمانے میں ہندو کے مشہور اڈیٹر مسٹر کستوری رنگا ایر اور مسٹر رنگا سوامی ایر نے بھی وفات کی۔ اسی زمانے میں دو کانگریسی روزنامے جاری ہوئے یعنی "فارورڈ" اور "ایڈوانس" "ہندوستان اسٹینڈرڈ"، کانگریس کا جدید ترین اخبار کلکتہ سے جاری ہوا ہے۔

بنگالی زبان میں دونوں بھائی مسٹر سیسر کمار گھوش اور مسٹر موتی لال گھوش نے "انند بازار پترکا" جاری کیا جواب دوسرے ہاتھوں میں ہے اور اس وقت ہندوستان بھر میں اس کی کثیر اشاعت ہے۔ صوبہ پنجاب میں لالہ لاجپت رائے نے اُردو میں "بندے ماترم" اور انگریزی میں "پیپل" نامی اخبارات نکالے۔ آخرالذکر سرونٹ آف پیپل سوسائٹی کا جس کے لالہ جی خود بانی تھے اخبار ہے۔ دہلی سے دو محب وطن روزنامے شائع ہوتے ہیں جن میں سے ایک "ہندوستان ٹائمس"، ہے جو اپنے وجود کے لئے لالہ لاجپت رائے اور پنڈت مدن موہن مالوی اور مسٹر گھنشام داس. برلا کی کوششوں کا ممنون احسان ہے۔ اور دوسرا نیشنل کال ہے۔ صوبۂ بہار میں پٹنہ کا جغرافیائی قیام اخبارات کے لئے زیادہ موزوں نہیں ہے۔ پٹنہ سے دو اخبار نکلتے ہیں۔ ایک "سرچ لائٹ" کانگریسی خیالات کا ہے اور دوسرا "انڈین نیشن"، ہے جس کے مالک مہراج دھراج مہاراجہ صاحب دربھنگہ ہیں۔ صوبہ متوسط میں دو اخبار ہیں یعنی "ڈیلی نیوز" اور سرونٹ آف انڈیا سوسائٹی کا اخبار "ہتواد"۔ اس دَوران کے معروف ترین صحافت نگاروں میں دو حضرات خاص طور پر قابل ذکر ہیں جنھوں نے بہت نمایاں صحافتی خدمات انجام دی ہیں یعنی لاہور کے اخبار "ٹریبیون" کے اڈیٹر بابو کالی ناتھ رائے اور "بمبئی کرانیکل" کے اڈیٹر سید عبداللہ بریلوی۔ اسی دَور میں مہاتما گاندھی نے بھی صحافت نگاری اختیار فرمائی۔ پہلے آپ نے "ینگ انڈیا" کو جو انگریزی میں تھا

اپنے ہاتھوں میں لیا اس کے بعد گجراتی اخبار "نواجیون" کے ذریعے سے صحافتی دلچسپی قائم رکھی اور اب "ہریجن" میں لکھتے ہیں۔ جس طرح آپ کا رنگ سیاسیات میں انوکھا ہے اسی طرح صحافت نگاری میں بھی آپ کا رنگ بالکل نرالا ہے۔ آپ اپنے اخبارات میں کوئی بھی اشتہار نہیں شائع ہونے دیتے۔ آپ کا انگریزی کا طرز نگارش بہت سادہ ہے جس میں انجیل کی سادہ انگریزی کی کافی جھلک پائی جاتی ہے۔

(**نوٹ از مترجم**۔ تعجب ہے کہ مسٹر چنتامنی نے "کامریڈ" کا جو مولانا محمد علی مرحوم کی ادارت میں پہلے کلکتہ اور بعد میں دہلی سے نکلتا رہا ذکر نہیں کیا۔ حالانکہ کامریڈ اپنی گوناگوں خوبیوں کی وجہ سے بہت زیادہ مقبول عام ہوا۔ مولانا مرحوم اپنے وقت کے زبردست ترین انگریزی اور اردو کے انشا پرداز تھے آپ کے کامریڈ کے مضامین علاوہ اور خوبیوں کے انگریزی ادبیت کے بہترین نمونے ہوتے تھے۔ میں نے اپنے استاد پروفیسر ڈن سے مولانا مرحوم کی انگریزی کی تعریف سنی ہے۔ اسی طرح مسٹر چنتامنی نے الہ آباد کے مشہور و معروف روزنامہ "انڈپنڈنٹ" کا ذکر نہیں کیا جو فروری ۱۹۱۹ء میں الہ آباد سے ملک کے مشہور و معروف صحافت نگار اور شہرہ آفاق مقرر مسٹر سید حسین کی ادارت میں شائع ہونا شروع ہوا تھا۔ یہ اخبار پنڈت موتی لال صاحب مرحوم کا اخبار تھا اور نہایت آب و تاب سے پہلے مسٹر سید حسین کی ادارت میں اس کے بعد مسٹر بپن چندر پال اور پھر مسٹر جارج جوزف اور مسٹر رنگا ایر کی ادارت میں شائع ہوتا رہا۔ راقم السطور کا تعلق اس اخبار سے عرصہ تک رہا ہے جس کی دلچسپیاں اور ادبی سرگرمیاں اکثر یاد آتی ہیں اور بے چین کر دیتی ہیں۔ اس مقام پر یہ بھی کہنا پڑتا ہے کہ قابل مقرر مسٹر چنتامنی نے اردو کے مشہور اخبارات کا تذکرہ نہیں کیا۔ کم از کم پنجاب کے سلسلہ میں مولانا ظفر علی خاں کا روزنامہ "زمیندار" اور مولانا محمد علی کا روزنامہ "ہمدرد" ہر حالت اور ہر حیثیت سے

قابلِ ذکر ہیں۔ علاوہ بریں ملک میں "انقلاب" "سیاست"، ہمدم، حقیقت، مدینہ، اور نیز دیگر اخبارات مثلاً تیج، ریاست، ورکرم ویر بھی اس دَور میں نکلے جو ملک کی خدمت برابر انجام دیتے رہے ہیں۔ اسی سلسلہ میں اینگلو انڈین اخبارات کا تذکرہ بھی ضروری تھا خصوصاً "پائنیر"، "ٹائمس آف انڈیا" اور اسٹیٹس مین کا ذکر۔ خصوصاً پائنیر کا تذکرہ جو اب اینگلو انڈین اخبار نہیں رہا بلکہ اس کے بجائے اب ہندوستانیوں کا آزاد خیال اور زمینداروں کا انصاف پسند اخبار ہے اور بجائے الہ آباد کے اب چند سال سے لکھنؤ سے نکل رہا ہے۔ ہندی میں بھی اس صوبہ میں "آج" "بھارت" وغیرہ نے جاری ہوکر ملک کی خدمت کی ہے اور صحافتی نقطۂ نظر سے بلند پایہ اخبار ہیں۔)



مشہور و معروف شخصیتیں

ہمارے نیتا یا قائد

اس دور کے تمام رہبروں اور لیڈروں میں نظرتاً اور قدرتاً مہاتما گاندھی کا مرتبہ سب سے اونچا اور بلند ہے۔ آپ کی وہ عدیم المثال اور یگانۂ روزگار ہستی ہے جس کا مقابلہ کسی دوسرے سے ہرگز ہرگز نہیں کیا جا سکتا۔ آپ سے پہلے اور نہ آپ کے معصرون میں کسی کو وہ زبردست قدرتِ عامہ خلائق اور پبلک ذہنیت پر حاصل ہوئی جو آپ کو حاصل ہے اور جس پر آپ فائز ہیں۔ ۱۹۰۹ء کی لاہور کی کانگریس کے موقع پر مسٹر گوکھلے نے مہاتما جی کی ان الفاظ میں تصویر کشی فرمائی تھی۔

"جنوبی افریقہ میں مسٹر گاندھی نے جو غیر فانی کام کئے ہیں وہ مجھے اسکے کہنے پر مجبور کرتے ہیں کہ کوئی شخص خواہ اس انجمن میں ہو یا کسی دوسری انجمن میں، ان کا نام انتہائی فخر و محبت کے بغیر نہیں لے سکے گا۔ میری زندگی کی یہ ایک اہم نعمت ہے کہ میں بہت اچھی طرح مسٹر گاندھی کو جانتا ہوں اور میں یہ کہوں گا کہ ان سے زیادہ پاک و صاف، ان سے زیادہ دلیر اور ان سے زیادہ بلند ہستی اس زمین پر کبھی نہیں ہوئی ہے۔ مسٹر گاندھی اُن نفوس میں سے ہیں جو زندگی کے بلند ترین اصولوں پر پابند رہ کر اور اپنی زندگی نہایت پاک و صاف بسر کرتے ہوئے بنی نوع انسان کی محبت میں سرشار ہیں، جن کے قلوب صدق و سچائی سے مملو ہیں اور جو انصاف کے

متوالے ہیں اور جو اپنے کمزور بھائیوں پر اپنی خوبیوں سے جادو سا کرتے ہیں اور ان کے سامنے نیا روحانی منظر پیش کرتے ہیں۔ انھیں کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ یہ انسانوں میں انسان، ہیرو میں ہیرو، محب وطنوں میں محب وطن ہیں اور اس میں کوئی کلام نہیں کہ موجودہ وقت میں ہند کی پوری خلقت اوصاف حمیدہ کا بہترین نمونہ آپ کی ہستی میں پیش کر رہی ہے۔"

مسٹر گاندھی میں بہت سی وہ بھلائیاں پائی جاتی ہیں جنھوں نے انھیں اس عزت و عظمت کا مستحق بنا دیا جو ان کے ہموطن کر رہے ہیں۔ سچ ہے وہ مہاتما ہیں جب وہ بیرسٹری کرتے تھے تو وہ بہت کامیاب بیرسٹر تھے۔ میں نے ان کی زبانی یہ بات سنی ہے کہ اگر اُس وقت بھی کسی موقع پر یہ معلوم ہو جاتا تھا کہ ان کے مؤکل نے انھیں سچ حالات نہیں بتائے ہیں تو وہ فیس اور مسل واپس کر دیتے تھے۔ برسہا برس کی بیرسٹری سے جو کچھ انھوں نے بچایا تھا سب کا سب اپنے جنوبی افریقہ کے ہموطنوں کو دے دیا۔ ان کی نظر میں روپیہ کا کوئی مصرف خود اُن کے لئے نہیں تھا۔ اور یہ بات بالکل صحیح ہے کہ انھیں روپے کی ضرورت نہیں ہے البتہ اُس حالت میں جبکہ روپیہ ان کے اہل ملک کی خدمت کے لئے درکار ہو ان کا دل خوف و ہراس سے بالکل پاک وصاف ہے اور مجھے علاوہ مہاتما کے کوئی دوسری ذات ایسی نظر نہیں پڑتی جو خوف و خطر سے اس درجہ ناآشنا ہو۔

ان کی روحانیت بہت بلند ہے اور اخلاقی بھلائیاں سب کی سب ان میں موجود ہیں۔ انھوں نے اُس صدق و سچائی کو حاصل کر لیا ہے جس کی تلقین شیو نے بنی نوع انسان کو کی ہے۔

وہ ظاہرا میں سنیاسی تو ہیں نہیں مگر اس وقت دنیا میں ان سے بڑھ کر کوئی دوسرا

سنیاسی نہیں ہے اس لیے کہ انھوں نے لارڈ کرشن کے نصب العین کو حاصل کر لیا ہے۔

ان کا ضمیر خواہشات اور لذات سے پاک و صاف ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ دادا بھائی نوروجی کی طرح مہاتما جی بھی اس ملک کے نظام سلطنت کے نہایت سخت نکتہ چیں ہیں مگر جو لوگ اس نظام کو چلا رہے ہیں ان میں سے کسی کے خلاف ان کے دل میں کسی برائی کا شائبہ بھی نہیں پایا جاتا۔ مہاتما جی اسی کے پابند ہیں۔ اگر بحیثیت مجموعی ان کی ذات پر غور کیا جائے تو کسی ہندوستانی کو اس کے کہنے میں تامل نہ ہوگا کہ اس وقت دنیا میں ان کی ہستی عظیم ترین ہے۔ اس ذلیل دور اور کلجگ کے زمانے میں ایسی بلند اور ارفع ہستی کا پیدا ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ باوجود غیر امید افزا حالات کے جو چاروں طرف نظر آتے ہیں قدرت کا یہ منشا ہے کہ ہمارا متبرک ملک جو رشیوں اور منیوں کا گہوارہ رہ چکا ہے دوبارہ اپنی قدیم عظمت پر پلٹ آوے۔ گاندھی اور ٹیگور دونوں نے موجودہ ہندوستان کی عزت کا سکہ مہذب دنیا کے دلوں پر بٹھا دیا ہے۔

ان حالات اور ان باتوں سے قطع نظر کرتے ہوئے اب ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ مہاتما جی کا مرتبہ بحیثیت ایک سیاست داں اور مدبر کے کیا ہے؟ کوئی انسان معصوم نہیں ہے۔ کوئی آدمی غلطیوں سے قطعی پاک و صاف نہیں ہو سکتا۔

الانسان مرکب من الخطاء والنسیان

انسان سے سہو اور غلطی کا ہونا اس کے خمیر میں ہے۔ یہی نہیں بلکہ اوتار بھی جب انسانی شکل و شباہت میں آئے ہیں تو ان سے بھی غلطی اور سہو کا امکان ہوا ہے۔ محض خدا کی ذات کے سوا کوئی دوسری ذات غلطی، سہو اور دوسری کمزوریوں اور خامیوں سے مکمل طور پر پاک و صاف نہیں ہے۔ صرف خدا مکمل محاسن اور اوصاف حمیدہ سے ہے دوسری کوئی ہستی نہ ہوئی ہے اور نہ ہو سکتی ہے۔ میں لارڈ ایکٹن کے

قول کی تائید کرتا ہوں کہ فانی انسان پر انتہائی اعتماد و عقیدہ کرنا غلطی ہے۔ مزید براں مجھے مسٹر برٹنڈرسل کے ان الفاظ سے اتفاق کلی ہے کہ کسی انسان کو معصوم خیال کرنا خطرہ سے خالی نہیں ہے۔ یہ بات مہاتما جی پر بھی صادق آتی ہے وہ بھی انسان ہیں اس لئے کسی شخص کے بارے میں یہ خیال نہ کرنا چاہئے کہ اگر وہ مہاتما جی کو خاطی تصور کرے تو وہ ان کی وہ عظمت اور عزت جو ان کے لئے سزاوار ہے نہیں کر رہا ہے۔ یہاں اس سے بحث نہیں ہے کہ وہ موجودہ حالت سے کہیں زیادہ بلند مرتبہ رکھتے ہوئے اگر سیاسیات میں نہ پڑے ہوتے۔ مہاتما جی کے بارے میں غور سے مطالعہ کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ اگرچہ وہ ان سب لوگوں سے جنھوں نے سو برس کی مدت میں ملک کی سیاسی خدمات کی ہیں سب سے بڑے شخص ہیں تاہم وہ ملک کے سب سے زیادہ دانشمند رہنما نہیں ہیں۔ جب میں ان کی متعدد غلطیوں اور تلون مزاجی کو بحیثیت مجموعی بلا کسی جنبہ داری یا تعصب کے سوچتا ہوں تو میں اس نتیجہ پر پہونچتا ہوں کہ آئندہ اُن کی پالیسی کا جو بھی مآل ہو اُس نے موجودہ وقت میں نقصان ضرور پہونچایا ہے۔ مسٹر ج۔ اے۔ اسپنڈر نے ڈسرائیلی کے بارے میں کہا کہ وہ فطرتاً باطنیت اور مقدرات کے قائل آدمی تھے۔ یہ قول بہت حد تک مہاتما پر بھی صادق آتا ہے۔ یہ بدقسمتی ہے کہ ایسے بلند روحانی مدارج کے رکھنے والوں کے لئے سیاسیات نہیں بنائے گئے ہیں اور نہ سیاسیات ان کے لئے مناسب ہیں جبکہ ہندوستان اپنے حکمرانوں کی مدافعت یا ان کا مقابلہ جسمانی قوتوں سے اس وقت نہیں کر سکتا ہے۔ میں نان کوآپریشن کے غیر مدافعتی اخلاقی اصولوں سے بحث نہیں کر رہا ہوں۔ تو اس کے لئے کوئی دوسری ترکیب سوائے آئینی جدوجہد کے نہیں ہے۔ اس کے بارے میں بھی یقین کامل کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ حالات کے دیکھتے ہوئے آئینی جدوجہد مناسب و کارآمد ہو سکتی ہے۔

مہاتما جی یہ دریافت فرماتے ہیں کہ تاریخ میں وہ کون سی مثال ہے جہاں کسی ملک نے اپنی کھوئی ہوئی حکمرانی کو آئینی جدوجہد کے ذریعہ سے حاصل کیا ہے۔ اس کے جواب میں میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ بھلا وہ کون سی ایک بھی مثال ہے جہاں آپ کے طریقے سے حکمرانی واپس ملی ہو۔ سیاست دانوں کا ہرگز یہ کام نہیں ہے کہ وہ آئندہ کے آنے والے واقعات کو سوچیں اور ان کے لئے ابھی سے ترکیبیں سوچ رکھیں ہمیں موجودہ حالات کو پیش نظر رکھنا چاہئے اور اُن کے مطابق جو مناسب طریقہ ہو اختیار کرنا چاہئے۔ جو آئندہ ہوگا اس سے آئندہ والے سیاست داں نبٹیں گے یہ کام آئندہ والوں کا ہے۔ ہمارا کام موجودہ زمانے کی بابت ہو سکتا ہے نہ کہ ازل سے ابد تک کا معاملہ ہم کو سوچنا چاہئے۔ ہمیں آج اور کل کی بابت خیال کرنا چاہئے نہ کہ ان واقعات و حالات پر ابھی سے غور و خوض کرنا چاہئے جو ہمارے بیٹوں اور پوتوں کے زمانے میں درپیش ہوں گے یا ہونے والے ہوں۔ آئندہ کیا پیش آئیگا اس پر غور کرنا ایک فعل عبث ہے اس لئے کہ آئندہ کی خبر کسے ہے۔ اگر مہاتما جی اپنی نان کواپریشن کی تحریک نہ چلائے ہوتے خصوصاً جبکہ موجودہ اصلاحات شروع ہو رہے تھے تو اس پندرہ برس میں سیاسیات کا رخ ہی دوسرا ہوتا۔ اگر تحریک نان کواپریشن کا پرچار نہ ہوا ہوتا تو سب کے سب محبان وطن ایک دل اور ایک زبان ہوتے وہ اپنے عہدوں پر مجالس قانون ساز میں یا اس کے باہر دیگر اپنی سیاسی زندگی میں ایک ہوتے جس کا نتیجہ برطانوی گورنمنٹ پر کہیں زیادہ سود مند ہوا ہوتا بمقابلہ اس پھوٹ اور علیحدگی کے جو محبان وطن کی جماعتوں میں مہاتما جی کی افتراقی پالیسی سے پیدا ہو گئی ہے اور جس کا ہونا لابدی اعدہ ضروری تھا۔ ان کی نان وائلنس نان کواپریشن کی پالیسی حقیقت میں دو نفی کا مل کر اثبات کی کھلی ہوئی مثال ہے۔ مہاتما جی نے مقاومت مجہول کے دونوں الفاظ پر یکساں زور دیا ہے مگر

ان کے زیادہ ساتھیوں نے لفظ مجہول کا چنداں خیال نہیں کیا اور نہ اس پر پابند رہے۔ سول نافرمانی کی تحریک نے ہزاروں خاندانوں کو سخت نقصان پہونچایا۔ یہ سب قربانیاں اور یہ سب تکلیفیں کدھر لئے جا رہی ہیں اس پر تو غور کرنا چاہئے۔ ان کا نصب العین سوراج تو نہیں ہے بلکہ یہ تو ہمیں پھر اُنہی کاونسلوں میں واپس لے آ رہی ہیں۔ مہاتما جی خود ہمیشہ "ہنسا" پر پابند رہے مگر ان کے بیشتر ساتھی "ہنسا" کرتے رہے۔

طرفہ تماشہ یہ ہے کہ جس جماعت کے خلاف ان کی جد و جہد رہی ہے اور جس کے خلاف وہ اپنی پوری طاقت صرف کرتے رہے ہیں اُسی نے موقع و محل سے فائدہ اٹھا کر تمام باشندگان ملک کو سول آزادی سے جو پہلے حاصل تھی محروم کر دیا۔ صرف معجزہ دکھانے والے ہی بارہ مہینے کے اندر سوراج حاصل کر لینے کا وعدہ کر سکتے ہیں۔ آج کل کا زمانہ معجزہ کا نہیں ہے۔ وہی غلامی کی ذہنیت جس کے خلاف مہاتما جی نے انتہائی نفرت کا اظہار فرمایا وہی خود ہزاروں آدمیوں میں پیدا ہو گئی جنھوں نے یقین کر لیا کہ سوراج بارہ مہینے میں حاصل ہو جائے گا۔ اگر یہ اعتبار یہ اندھی تقلید غلامی کی ذہنیت کی مثال نہیں ہے تو پھر کیا ہے۔ مجھے یہ بالکل تسلیم ہے کہ مہاتما جی کی ہستی ہند میں عظیم ترین ہی ہستی نہیں ہے بلکہ ساتھ ہی ساتھ وہ موجودہ زمانے میں سب سے زیادہ بزرگ و متبرک شخص ہیں پھر بھی میری یہ رائے ہے کہ ان کی سیاسی پالیسی نے اکثر سخت نقصان بھی پہونچایا ہے اور ان سے اکثر چند اہم سیاسی فروگذاشتیں بھی سرزد ہوئی ہیں۔

ان تمام باتوں کے باوجود یہ امر مسلمہ ہے کہ مہاتما جی نے ایک بہت بڑا کام انجام دیا ہے۔ وہ ہے وہ بیداری جو عوام میں پیدا ہو گئی ہے۔ وہ ایثار و قربانی کا جذبہ اور حب وطنی کی لہر جو ملک میں دوڑ گئی ہے وہ بہادرانہ مقابلہ کا تخیل جو

دماغوں میں پیدا ہو گیا ہے یہ سب مہاتما جی کی تلقین اور فہمائش ان کے پند و نصائح ان کے ہدایات و تحریروں سے پیدا ہے جس کا ہونا صدیوں تک ناممکن تھا اگر گاندھی جی نہ ہوتے ۔ اس بیداری، اس جذبہ ایثار و قربانی اس تخیل کا کیا نتیجہ ہوتا اس کے بارے میں صحیح پیشین گوئی نہیں کی جا سکتی مگر پھر بھی گاندھی جی کے ہر ایماندار نقاد کو ان کی یہ بہت بڑی کارگزاری ضرور تسلیم ہے۔ سیاسیات چند روزہ ہیں، پالیسیاں چند دنوں میں مٹ جاتی ہیں، انھیں دنیا بھول جاتی ہے مگر انسان کا کیرکٹر اس کے اخلاق و عادات، اس کا رہن سہن یاد رہتے ہیں۔ جب موجودہ وقت کے اختلافات لوگ بھول جائیں گے اس وقت بھی موہن داس کرم چند گاندھی کا نام اور کیرکٹر زندہ رہے گا۔ مہاتما جی بہترین اخلاقیات اور اہم ترین خوبیوں کا ایک زندہ درس ہیں اور ہندوستان کی تاریخ میں آپ کا نام نامی ہمیشہ ہمیشہ درخشاں اور سنہرے الفاظ میں نمایاں نظر آئے گا۔ اور ہم سب کو اس کا فخر ہے کہ قدرت نے ایسی بلند ہستی کو ہمارے ملک میں پیدا کیا اور ہمارے ملک کو ان کا جنم بھوم قرار دیا۔ اس پر ہم جس قدر فخر و مباہات کریں کم ہے۔

دیگر خدّامِ خلق

ہمارے دوسرے قائد (نیتا)

سر سیوا سوامی ایر

اس زمانے کے دوسرے رہنماؤں میں مہاتما گاندھی اور پنڈت مدن موہن مالوی کے بعد اگر کسی کا درجہ ہوسکتا ہے تو وہ سر سیوا سوامی ایر کا ہے۔ آپ کی قابلیت، آپ کا علم وفضل، آپ کا رہن سہن، آپ کی صحیح اور وسیع معلومات، آپ کی عدیم المثال مدبرانہ تجاویز پوری قوم کے لئے باعث نازش ہیں جن کی قدر و منزلت کسی ملک میں ضرور ہوئی ہوتی۔ آپ سے زیادہ صحیح اور صائب الرائے ہم میں کوئی نہیں ہے۔

مسٹر سری نواس شاستری

مسٹر گوکھلے کے بعد سرونٹ آف انڈیا سوسائٹی میں اُن کے جانشین مسٹر سری نواس شاستری ہوئے جنھوں نے بین الاقوامی شہرت حاصل کی ہے۔ آپ بہت بڑے فاضل اور ماہر تعلیمات ہیں اور آپ کی قوت تقریر بہت نمایاں اور حیرت انگیز ہے۔ آپ نہایت بےلوث اور ایماندار ہیں جن کی حب الوطنی سخت ترین مخالفوں کو بھی تسلیم ہے۔

اسی سیاسی خیالات کے ایک بزرگ ہم میں اور موجود ہیں جنھوں نے شروع سے لے کر اب تک بہت سے اچھے اور عمدہ کام کئے ہیں۔ آپ کا نام نامی سر۔ یم۔ رام چندر راؤ ہے (اب آپ کی وفات ہوگئی) آپ کسی کام کو اپنے ہاتھوں میں اس وقت تک نہ لیتے جب تک کہ آپ انتہائی خوبی سے اسے سرانجام نہ دینے پر

یقین نہ کر لیتے۔ آپ کی تعریف سب لوگ کرتے۔ توضیح و تصریح پر جو ملکہ ان کو حاصل تھا اس کی دوسری مثال مجھے نظر نہیں آتی۔ اس کے بعد سر۔ سی۔ پی۔ راماسوامی ایر ہیں جن کی غیر معمولی قابلیت نے مسٹر مانٹیگو سے خراج تحسین حاصل کیا۔ مسٹر جی۔ اے۔ ناٹسن بحیثیت صحافت نگار اور سیاست داں بہت کافی میز ہیں۔

صوبہ مدراس کے کانگریسی لیڈروں میں میں پہلی جگہ مسٹر۔ سی راجہ گوپال چاری کو ضرور دوں گا۔ مدراس کے کانگریسی لیڈروں میں دس برس قبل طباعی و ذہانت میں مسٹر لیس۔ سری نواس آینگر تھے۔ اگر ان میں استقلال بھی اُسی حد تک ہوتا جس قدر کہ اُن کی ذہانت تھی تو وہ ملک کے لئے بہت بڑے بڑے کام کر ڈالتے۔ مسٹر کونڈا ونکٹا پایا پنٹالو ایک نہایت ایثار پسند اور دلیر محب وطن ہیں جنھیں صحیح طور پر اندھرا اضلاع میں پہلی جگہ دی گئی ہے۔

مسز سروجنی نائیڈو آپ پیدائشی لحاظ سے بنگالی اور ازدواجی نقطہ نظر سے دکھنی ہیں جو سیاسی کاموں کے لئے بمبئی میں رہتی ہیں آپ بہت بلند مرتبہ شاعرہ ہیں۔ آپ نے سیاسیات میں شاعری کا لطف و کیف پیدا کر دیا ہے اور شاعری کی جلا سیاسیات کو دے دی ہے اور آپ نے ایسی شہرت حاصل کی کہ کانگریس کی صدر بھی منتخب ہو چکی ہیں۔ آپ کی شخصیت مسحور کن اور من موہنی ہے اور انگریزی زبان پر آپ کو حیرت انگیز ملکہ حاصل ہے یہ امر مسلمہ ہے کہ آپ اس وقت ہندوستان میں ایک بہترین مقررہ ہیں مگر گفتگو کرنے میں آپ اس سے بھی زیادہ بلند مرتبت ہیں۔ مکالمہ و گفتگو میں تو میرے دیکھنے میں اس وقت ہندوستان میں آپ خود اپنی مثال ہیں۔

مسٹر جناح مسٹر محمد علی جناح سب سے بہتر نکتہ سنج بحث و مقرر ہیں آپ کی سب سے زیادہ نمایاں خصوصیت "نڈر پن" اور بے خوفی ہے۔

میرے دیکھنے میں تو کوئی دوسرا شخص ایسا نہیں ہے کہ جو کسی بڑے سے بڑے آدمی کے سامنے اس طرح بے خوف دھڑاس گفتگو کر سکتا ہو جیسے کہ مسٹر جناح یہی نہیں کہ صاف الفاظ میں بلکہ کھرے الفاظ میں -

آپ تھوڑے عرصہ سے ابھی حال میں بمقابلہ ایک محب وطن کے فرقہ پرست کی حیثیت سے زیادہ نمایاں ہوئے ہیں - یہ ملک کی صریحی بدقسمتی کے سوا کچھ اور نہیں ہے -

ڈاکٹر آر، پی، برنجپی

ڈاکٹر صاحب خدامِ وطن میں سب سے زیادہ صاف باطن شخص ہیں - ان میں دکھاوا نہیں ہے - ان کا ظاہر و باطن ایک سا ہے - آپ نے جو ۱۹۲۴ء کے اجلاس نیشنل لبرل فیڈریشن کا خطبۂ صدارت لکھنؤ میں پڑھا تھا اس میں جو کانگریسی لیڈروں اور ان کی پالیسی کے بارے میں صاف صاف الفاظ کہے تھے اُس پر چند احباب نے سخت نکتہ چینی کی تھی - اس کا جواب جو ڈاکٹر موصوف نے دیا وہ ان کی صاف گوئی کا نمونہ ہے جو ذیل میں درج ہے -

"میرے اوپر حال میں اکثر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ میں ضرورت سے زیادہ صاف گو اور کھرا آدمی ہوں - مجھے یہ تسلیم ہے کہ میں کھرا آدمی ہوں اپنی تمام زندگی میں نے بحیثیت ریاضیات کے معلم کے گزاری ہے - ریاضیات کے معلم کے لئے مبہم زبان استعمال کرنا ناممکن سی بات ہے - ریاضیات کے معلم کا فرض یہ ہے کہ صاف طریقہ اور طرز کے الفاظ استعمال کرے جس کی مجھے عادت ہو گئی ہے اور یہ زندگی بھر کی عادت میں چھوڑ نہیں سکتا ..... -

ہم اپنے ملک میں یہ اکثر دیکھتے ہیں کہ چند نظریے ایجاد کئے جاتے ہیں جن پر اتفاق رائے کی کوشش کی جاتی ہے اور لوگ اس کے مختلف معنی پہنانے میں اپنی عمریں صرف کر دیتے ہیں - مجھے یہ طریقہ ناپسند ہے اور نہ مجھ کو ذرا بھی یقین ہے

میں تو صاف صاف دو ٹوک بات پسند کرتا ہوں" یہاں پر یہ کہنا پڑتا ہے کہ ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور بھی ایسے ایجاد بندہ نظریوں کے خلاف ہیں۔ جن لوگوں نے ڈاکٹر .ر بنجی کی زندگی پر اپنے خاص اثرات ڈالے وہ دو شخص تھے ایک مسٹر گوکھلے اور دوسرے مسٹر کاروے۔ مسٹر کاروے وہی مشہور ہستی ہیں جو ہندوستان کی عورتوں کی یونیورسٹی کے بانی تھے۔

مسٹر وٹھل بھائی پٹیل۔ ملک کی جنگ آزادی کے ایک بہادر سپاہی تھے ان کے چھوٹے بھائی مسٹر ولبھ بھائی پٹیل جو کسانان گجرات کی خدمت کے صلہ میں سردار کہے جاتے ہیں۔ مہاتما گاندھی کے داہنے ہاتھ ہیں۔ مسٹر ین اسی ٹلکر تک اسکول کے تجربہ کار بزرگ ہیں مسٹر ایم۔ آر۔ جیکر نے پہلے بحیثیت ممبر ہوم رول لیگ اور بعدہٗ بحیثیت نان کواپریٹر شہرت حاصل کی۔ ان کی موجودہ سیاسی رائے لبرل پارٹی سے بھی زیادہ معتدل اور ہلکی ہے آپ کی قابلیت اور طاقت تقریر مشہور ہے۔ ہز ہائینس آغا خاں بیشک بڑے پایہ کے مدبر ہیں اگرچہ وہ ملک کی بدقسمتی سے فرقہ وارانہ خصوصیت نہ رکھتے ہوتے تو وہ ضرور آل انڈیا لیڈر ہوتے۔

سی، آر، داس

بنگال کے سب سے زیادہ مشہور و معروف رہنما چترنجن داس تھے۔ سر جارج جیسیل کی طرح جنھوں نے اپنے بارے میں کہا ہے۔ یہ مقولہ مسٹر داس پر بھی صادق آتا ہے۔ "یہ ممکن ہے کہ میری رائے صحیح ہو، یہ بھی ممکن ہے کہ میری رائے غلط ہو، مگر مجھے شک نہیں ہوتا" بڑی سے بڑی قربانی انکی نظروں میں کوئی حقیقت نہیں رکھتی تھی۔ وہ جس کام کا ارادہ کر لیتے تھے اس کا پورا کرنا عین ان کا مقصد تھا خواہ اس کی کچھ بھی قیمت ہو اور کسی طریقے سے ممکن ہو اس تھوڑی سی مدت میں جو قدرت نے ان کو عزت بخشی وہ بحیثیت ایک زبردست طاقت کے سیاسیات بنگال پر حاوی رہے جس کی مثال ان کے بعد اب تک نہیں مل سکی۔

مسٹر جے۔ ایم۔ گپتا اور مسٹر سوباش چندر بوس کانگریسی رہنماؤں نے اور سر پروس متر اور مسٹر جے۔ این۔ باسو لبرل لیڈروں میں بنگال کے دوسرے لیڈروں میں قابل ذکر ہیں۔ ایک شخص اور ہیں وہ سر عبدالرحیم ہیں جن کی فاضلانہ اور پُرمغز رپورٹ جو رائل کمیشن جسے اسلینگٹن کمیشن کہتے ہیں کے متعلق دی ایک اہم اور قابل تعریف سیاسی کارنامہ ہے جو حب وطنی اور اعلیٰ قابلیت کا بھی نمونہ ہے۔ آپ سیاسیات میں نمایاں حصہ لیتے رہے ہیں۔ کاش! آپ ہندوستانی زیادہ ہوتے اور مسلمان کم۔

موتی لال نہرو

اس دور کے سب سے بڑے صوبۂ متحدہ کے کانگریسی لیڈر پنڈت موتی لال نہرو گزرے ہیں۔ اپنی عمر کے بیشتر حصے میں وہ انگریزی اطوار اور عادات کے سب سے بڑے معرف تھے سیاسی زندگی میں چھیالیس برس کی عمر میں وہ سب سے پہلے ممالک متحدہ کانفرنس کے صدر کی حیثیت سے نمایاں ہوئے اس کے ۳ برس بعد وہ مجلس قانون ساز کے ممبر منتخب ہوئے مگر ۱۹۱۷ء میں جبکہ ان کی عمر ۵۶ برس کی تھی وہ پورے طور پر سیاست میں داخل ہوئے۔ اس سال سے پہلے ان کی سیاسی رائے بہت زیادہ اعتدال پسند تھی۔ مگر اپنے پُرانے خیالات کو بدل کر وہ انتہا سے زیادہ اور نہایت زود رفتار طریقے پر انتہا پسند ہو گئے! اور مہاتما گاندھی کے زمانے میں کانگریسی لیڈروں میں ان کی جگہ سی، آر، داس کے دوش بدوش تھی ان دونوں سے وہ زیادہ ذہین اور طباع تھے اور کانگریس کے جسم میں ان کا مرتبہ ۱۰ برس سے لے کر ان کی موت تک جو ۱۹۳۱ء میں اس ملک کی انتہائی بدقسمتی کی وجہ سے واقع ہوئی دل اور دماغ کا تھا۔ اس دس برس کی مدت میں پنڈت جی موصوف نے بڑی سے بڑی اور سخت سے سخت قربانیاں کر ڈالیں۔ باوجودیکہ ایسے شخص کا ایسی بڑی قربانیوں کا کرنا جس نے آرام پسند اور لطف کی زندگی بسر کی ہو کس قدر دشوار امر تھا مگر انھوں نے اسے بھی کر دکھایا، اور جیل کی مشقت برداشت کر ڈالی۔

ان کی خصوصیات میں کام کا اصول سے کرنا ایک طریقہ اختیار کرنا اور ذہانت کی مثالیں پیش کرنا خاص طور پر نمایاں تھا۔ صوبہ متحدہ اور مادرِ وطن کی یہ انتہائی بدقسمتی ہے کہ موت نے ایسے انمول موتی کو چھین لیا اور ہمیں مفلس بنادیا۔

سر تیج بہادر سپرو ایک دوسرے طرز کے بزرگ ہیں تعلیمی زمانے میں آپ نے بحیثیت طالب علم کے بہت کافی انعامات اپنی قابلیت سے پائے تھے۔ آپ نے وکالت کا پیشہ اختیار کیا اور الہ آباد ہائیکورٹ کے اس وقت سب سے بڑے ایڈوکیٹ ہیں۔ اپنی کالج کی زندگی سے آپ سیاسیات میں دلچسپی لیتے رہے ہیں۔ جب آپ نئے نئے وکیل تھے اسی وقت آپ نے سیاسیات میں عملی دلچسپی لینا شروع کردی تھی۔ گورنمنٹ سے مخالف حلقہ میں رہ کر اور نیز گورنمنٹ کے عہدہ پر مقرر ہو کر آپ نے اپنی قابلیت کا سکہ بٹھایا ہے۔ اپنی خداداد قابلیت کی وجہ سے آپ نے انگلینڈ میں بہت بلند شہرت حاصل کی ہے اور انگلینڈ کے بہت سے بڑے بڑے مدبر آپ کے گہرے دوست اور گرمجوش مداح ہیں۔ آپ نے ہمیشہ ایسے کام کئے جن سے آپ کے انتہائی علم وفضل کا اظہار ہوتا رہا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ حال میں آپ کی پرانی پارٹی کے کارکنوں اور آپ سے اختلاف رائے ہو گیا ہے مگر کوئی اختلاف رائے آپ کی قابلیت اور بیش بہا خدمات کو زائل نہیں کرسکتا۔ آپ کی اہم خصوصیات یہ ہیں۔ آپ ایک سچے دوست فراخ دل اور سیر چشم شخص ہیں جن میں اور بہت سی دل پسند اور دلفریب خوبیاں موجود ہیں۔

{(نوٹ از مترجم) اس فرقہ وارانہ ماحول میں اگر ہندوستان میں کوئی ایسا شخص چنا جاسکتا ہے جس پر ہندو اور مسلمان برابر کا بھروسہ کرسکتے ہوں تو وہ سر تیج بہادر سپرو ہیں۔ ممکن ہے کہ ہندو بھائیوں کو ان پر بھروسہ نہ ہو مگر اس میں کوئی کلام نہیں کہ سر تیج بہادر سپرو پر ان کی گوناگوں اور بیشمار خوبیوں کی وجہ سے مسلمانوں کو کلی بھروسہ ہے اور ہوسکتا ہے جس میں کسی شبہ کی کسی وقت میں

کوئی گنجائش نہیں۔}

مسٹر کنزرو میں نے پنڈت ہردے ناتھ کا تعارف پنڈت اجودھیا ناتھ کا بیٹا بتاکے کیا ہے آپ کا جسم وجان ۔ قلب وجگر سب کچھ حب وطنی میں سرشار ہے۔ آپ اپنی اوقات ۔ ہر سال کا ہر دن اور ہر گھڑی کا ہر لمحہ سیاسیات تعلیم اور اخلاقی خدمات میں صرف کرتے ہیں ۔ آپ سے زیادہ سیاسیات حاضرہ پر واقف ملک بھر میں کسی طبقہ میں کوئی دوسرا شخص نہیں ہے ۔ اس قابلیت کے ساتھ آپ ایک زبردست حافظہ اور دماغ کے مالک بھی ہیں ۔ علاوہ بریں آپ بہت ہی جفاکش ہیں آپ کا کیرکٹر بہت بلند ہے ۔

مسٹر جواہر لال نہرو مادرِ وطن کی نذر میں پنڈت موتی لعل نہرو نے اپنے اکلوتے بیٹے پنڈت جواہر لال نہرو کو پیش کیا (مترجم۔ اس نذر کی قدر ہوئی اور قبول ہوئی) پنڈت جواہر لال نہرو نے ولایت میں کل تعلیم حاصل کی اور بیرسٹری پاس کرنے کے بعد واپس ہوئے مگر اس پیشہ میں کبھی دلچسپی نہ لی۔ سیاسی زندگی میں داخل ہونے میں انھوں نے ذرا بھی دیر نہ کی اور جب داخل ہوگئے تو پھر کسی چیز کی پرواہ نہ کی ۔ اظہار خیال اور الفاظ میں آپ صاف گو ہیں ۔ رائے میں انتہا پسند ہیں ۔ عمل میں مستقل ارادہ نتائج سے لاپرواہیں یہ بھی کرشمہ تقدیر ہے کہ آپ ایسا انتہائی عیش وآرام کی زندگی بسر کرنے والا اور پھولوں کی سیجوں پر سونے والا مادر وطن کے لئے سخت سے سخت تکالیف برداشت کرڈالے اور بڑی سے بڑی قربانی کر کے دکھادے ۔ یہی وہ خوبیاں ہیں جو ان کے مخالفین سے بھی ان کے مؤیدین کی طرح خراج تحسین حاصل کر رہی ہیں ۔

ممالک متحدہ کی سیاسیات میں ایک دوسری ہستی قابل ذکر اور قابل عزت بابو پرسوتم داس ٹنڈن کی ہے باوجود غربت کے آپ نے اپنی وکالت ترک کر کے

اپنا پورا وقت بلکہ دھن، مَن، تن سیاسی کاموں کی نذر کردیا۔ آپ ایک سچے اور دلیر شخص ہیں جن کی نظروں میں کوئی ایثار کوئی تکلیف کوئی قربانی کچھ وقعت نہیں رکھتی۔ بابو راجندر پرشاد اس وقت صدر کانگریس ہیں جس کی ہر شخص انتہائی نیکی انتہائی ایمانداری اور انتہائی بے لوثی کی وجہ سے عزت کرتا ہے۔ صوبۂ بہار کے دوسرے لیڈر جو قابل ذکر ہیں۔

مسٹر سچدانند سنہا پہلے کانگریسی تھے اب کسی پارٹی سے تعلق نہیں رکھتے بڑے محب وطن ہیں آپ قانون داں صحافت نگار۔ سیاست داں۔ مقرر اور محبث ہیں۔ آپ چالیس برس سے برابر صوبہ اور ملک کی اچھی خدمتیں کر رہے ہیں سر علی امام اور حسن امام دونوں قابل فخر بھائیوں کا اس دَور میں انتقال ہوگیا۔ اپنی زندگی میں دونوں نے اچھے کام کئے ہیں۔ کانگریسی لیڈروں میں ڈاکٹر انصاری اور مولانا ابوالکلام آزاد دونوں صدر کانگریس رہ چکے ہیں اور قابل ذکر ہیں مولانا آزاد اُردو کے دلفریب مقرر ہیں۔ صوبۂ متوسط میں سر مارو پنتھ جوشی لبرل لیڈر ہیں جو ۴۰ برس سے خدمت وطن انجام دے رہے ہیں اور ۱۹۱۸ء تک کانگریس میں شریک رہے۔ علی برادران کو کہاں جگہ دی جائے۔ اس کا تعین قدرے مشکل ہے مسٹر محمد علی زیادہ ذہین و طباع تھے۔ مولانا شوکت علی کی شخصیت غالباً زیادہ اثر پذیر ہے۔ صوبۂ پنجاب میں اس دَور میں سر محمد شفیع سب سے زیادہ نمایاں لیڈر گذرے ہیں۔

رابندر ناتھ ٹیگور میں نے آپ کا ذکر آخر میں کرنا اس لئے چاہا کہ آپ سیاسیات کی زندگی میں شامل نہیں ہیں۔ آپ بنگالی ہیں مگر پورا ملک آپ کو اپنا فرزند کہنے کا دعویدار ہے آپ کی مہاتما گاندھی کی طرح تمام دنیا میں شہرت حاصل ہے کیا مجھے اس کے کہنے کی ضرورت ہے کہ میں اس رابندر ناتھ ٹیگور کا

ذکر کر رہا ہوں جو ایک بہت بلند پایہ شاعر ہے اور ہندی قوم پرستی کا پیامبر ہے۔ انگلینڈ۔ فرانس۔ جرمنی یا بلجیم ان تمام ریلوے اسٹیشنوں کی کتابوں کی دوکانوں پر جہاں میرا گذر ہوا میں نے ٹیگور کی تصانیف کا مختلف زبانوں میں ترجمہ بکتے ہوئے پایا۔ ناروے کے ایک شریف شخص نے جس کے ساتھ میں پیرس سے وارسیلز جا رہا تھا مجھ سے یہ کہا کہ ناروے میں ٹیگور کا نام گھر گھر مشہور ہے اور اس نے ٹیگور کی تمام مشہور کتابوں کا ترجمہ اپنی مادری زبان میں پڑھا ہے۔ اس نے مجھ سے کہا کہ وہ تمام ہندوستانیوں کو دنیا بھر میں سب سے زیادہ پڑھا لکھا خیال کرتا ہے۔ میں نے جب اپنے ملک کی جہالت اسے بتائی تو وہ گھبرا اُٹھا اور اس نے کہا کیا یہ بھی ممکن ہے کہ ٹیگور کے ہموطن اور جاہل ہیں یہ قابل یقین نہیں۔ ہم قدرت کے جس قدر ممنون ہوں کہ اس نے ہمارے ملک میں گاندھی اور ٹیگور پیدا کئے کم ہے۔

[**نوٹ** از مترجم۔ یہاں پہونچ کر ہمیں اس بات پر تعجب ہوتا ہے کہ لائق ممبر ڈاکٹر چنتامنی نے چند نہایت مشہور و معروف لوگوں کا ذکر نہیں کیا ہے۔ مثلاً خود ہمارے صوبہ میں مرحوم راجہ صاحب محمود آباد راجہ سر محمد علی محمد خاں صاحب مرحوم۔ ڈاکٹر جگت نرائن ملا۔ نواب صاحب چھتاری اور کلکتہ کے مشہور و معروف صحافت نگار اور قومی کارکن سری جوت راما نند چٹرجی اڈیٹر ماڈرن ریویو اور اسی طرح اکثر یگانۂ روزگار کا ذکر خصوصاً بمبئی کے مشہور بیرسٹر اور ملک کے مشہور محب وطن سر چمن لال سیتلواد اور ہمارے صوبہ کے قومی مجاہد اور مادرِ وطن کے مشہور فدائی مولانا فضل الحسن صاحب حسرت موہانی کا ذکر ضروری تھا علاوہ بریں کچھ بھی اختلاف رائے ہو ہمیں یہ تسلیم ہے کہ تین ہستیاں خاص طور پر قابل ذکر ہیں جنھیں اپنے تدبر کی وجہ سے بین الاقوامی شہرت ضرور حاصل ہے اور جو بڑے محب وطن اور قابل قدر مدبر بلا تامل کہے جا سکتے ہیں یعنے سر اکبر حیدری۔ سر مرزا محمد اسمٰعیل اور سر سی، پی، راما سوامی ایر]

فصل پنجم

خاتمۂ کلام

کامیابیاں اور ناکامیابیاں

غدر سے لے کر آج تک ۸۰ برس کی مدت میں ہندوستانی سیاسیات میں جو ترقیاں، انقلابات، اور تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں ان پر میں نے ایک سطحی نظر ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ جنھیں اب میں ختم کرنا چاہتا ہوں اس دَور کی ہندوستانی سیاسی تاریخ ہمیں کیسے نتیجہ پر لئے جا رہی ہے؟ ترقی کا خیال تعلیم یافتہ ہموطنوں کے دلوں میں جاگزیں ہو چکا ہے اور پوری طرح جم گیا ہے بہت سے محبان وطن نے سیاسی ترقی حاصل کرنے کی با اصول کوششیں بھی کی ہیں۔ عام لوگوں کے حالات سُدھارنے کے علاوہ محبان وطن کا مقصد سوراج کے ماتحت آزادی حاصل کرنا جو سب سے زیادہ قیمتی شے ہے بھی رہا ہے۔ جس کے بغیر مادرِ وطن کی عزت پورے طور سے قائم نہیں ہو سکتی۔ ہمیں حب وطنی کی وہ تاریخ جو لارڈ روزبری نے کی ہے "قوم کی خودداری" یاد رکھنا چاہئے۔ اب ہمیں دیکھنا ہے کہ کیا ہماری کوششیں ٹھیک طور سے اور باترتیب ہوتی رہی ہیں کیا دانشمندانہ طور پر ترکیبیں برتی جاتی رہی ہیں۔ صحیح نیت اور ہر قربانی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے کیا کامیابیاں بھی حاصل ہوتی رہی ہیں۔ اس کے جانچنے کے لئے مختلف

عنوانات اور اس کے پرکھنے کے لئے متعدد کسوٹیاں ہیں - کیا محبان وطن نے خدمت خلق کرنے کا جذبہ ہمارے بڑھتے ہوئے اہل وطن کے دلوں میں پیدا کر دیا ہے شکایات کی تلافی کرنے کے لئے ان لوگوں نے کیا کامیابی حاصل کی اور جو نصب العین ان لوگوں نے اپنے سامنے رکھا اس کے قریب یہ لوگ کہاں تک پہونچے ہمیں یہ بھی دیکھنا ہے - کیا پہلے سے آج وہ اس نقطۂ نظر کے اور نصب العین کے قریب ہیں اس کا جواب ہمیں تسکین بخش ملتا ہے - اس لئے کہ بہت کچھ پورا ہو چکا ہے - ساتھ ہی ساتھ ناامیدی بھی ہمیں پریشان کر دیتی ہے - جبکہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ باوجود ۳/۴ صدی تک برابر کام کرنے کے بعد ہماری منزل مقصود ابھی دُور ہے اور منزلیں زیادہ کٹھن ہیں مختلف طبائع مختلف نتائج پر پہونچیں گی اور مختلف رائیں اس کے بارے میں ہوں گی - مجھے ۱۸۹۴ء کا وہ منظر یاد ہے کہ جب مسٹر راناڈے نے اپنے خطبۂ صدارت میں اصلاحات عامہ کے بارے میں اپنی خوشی کا اظہار فرمایا تھا اور ڈاکٹر (سر رام کرشن) بھنڈارکر نے انہیں واقعات پر تبصرہ کر کے ناامیدی کا اظہار کیا تھا - میرا خیال ہے کہ صحیح نتیجہ اسی وقت نکل سکتا ہے جبکہ مختلف زاویہ نگاہ کو مد نظر رکھ کر رائے قائم کی جا سکے اور تدبر کی تعریف بھی یہی ہے یعنی مختلف زاویہ نگاہ کو مد نظر رکھنا - یہ مناسب نہیں ہے کہ کامیابیوں کو دیکھ کر ہم اپنی ناکامیابیاں بھول جائیں یا جو کام ہمیں کرنا ہے اُس سے گھبرا کر ہم جو کچھ کر چکے ہیں اس کا خیال چھوڑ دیں - کچھ لوگ تو ایسے دماغ رکھتے ہیں جو واقعات اور حالات کو نہیں دیکھتے اور موسلا دھار بارش کو بھی اچھا موسم کہتے ہیں - کچھ ایسے بھی ہیں جو آفتاب کو بُرا ٹھہراتے ہیں اس لئے کہ علم ہیئت والے اس میں داغ بتاتے ہیں - صحیح رائے تو وہی ہے جس کے متعلق مسٹر راناڈے نے فرمایا ہے کہ باحتیاط نتائج اور اعتدال سے کام لیا جائے -

دو سوالات | دو سوالات پیدا ہوتے ہیں (۱) خدمت خلق کا جذبہ اور تنظیم کا شوق

بغرض خدمت خلق کس حد تک لوگوں کے دلوں میں پیدا ہو چکا ہے۔ (۲) گورنمنٹ نے کس حد تک اپنا تحکمانہ، جابرانہ، غیر ذمہ دارانہ طریقہ چھوڑ کر ذمہ دارانہ آئینی طرز حکومت اختیار کیا۔ سوال یہ ہے کہ کیا جو اصلاحات طرز حکومت میں وقتاً فوقتاً ہوتے رہے ہیں وہ اہل ملک کے فائدے کو مدنظر رکھ کر کیے گئے ہیں۔

کیا ملک کی اقتصادی حالت بہتر ہوئی ہے؟ کیا تعلیم ملک میں پورے طور سے پھیل چکی ہے؟ کیا سماجی اصلاحات اس غرض سے کیے گئے ہیں کہ سماج اور سوسائٹی کی حالت بہتر ہو اور ساتھ ہی ساتھ مختلف فرقوں میں قومیت کا اور یکجہتی کا جذبہ زیادہ پیدا ہو۔

خدمتِ خلق یا سیاسی زندگی

پہلے سوال کا جواب آسان ہے۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ خدمت خلق کی تنظیم اور اس کے جذبات آج ملک میں اس قدر زیادہ ہیں کہ ان کا مقابلہ پہلے کی حالت سے کرنا ایک فعلِ عبث ہے۔ جب ہم پہلے زمانے کی حالت کو دیکھتے ہیں تو ہم کو اپنے پرانے لیڈروں کو صدائے آفرین کے ساتھ یاد کرنا ضروری ہوتا ہے جنھیں دل شکن حالات کے ساتھ اور ناموافق زمانے میں استقلال کے ساتھ اس کام کے لیے کوششیں کرنی پڑیں اور جنھوں نے ایسی مضبوط نیو رکھی جس کی عمارت آج ہم دیکھ رہے ہیں پہلے انھیں علٰحدہ علٰحدہ کام کرنا پڑا پھر چھوٹی چھوٹی جماعتیں بنائیں پھر صوبہ وارانہ انجمنوں کو قائم کیا اس کے بعد آل انڈیا تنظیم قائم کی۔ اس آل انڈیا تنظیم کو ہم انڈین نیشنل کانگریس کے نام سے آج یاد کرتے ہیں۔ ۱۸۹۱ء میں ناگپور کے مقام پر مسٹر ہیوم نے اظہار مسرت کیا تھا کہ وہ کانگریس کا ساتواں اجلاس ہے۔ ۲۰ برس کانگریس ہونے کے بعد اس کی زندگی میں ایسا دور آیا جبکہ اس کے ٹوٹنے کا سخت احتمال پیدا ہو گیا۔ چنانچہ اس کے بائیسویں اجلاس میں جھگڑے ہوئے اور اجلاس

برخاست کر دیا گیا تھوڑے دنوں کے بعد اس کا پھر جلسہ ہوا اس کی پالیسی میں تغیرات ہوئے اور مختلف ہاتھوں میں اس کی تشکیل اور تنظیم جاتی رہی اس کے قائم کرنے والوں میں سے آج ایک بزرگ زندہ ہیں سر ڈنشا واچا (اب انتقال ہوگیا) اور بہت سے پرانے ممبر اب بھی زندہ ہیں۔ بہت سے پرانے کانگریسی ممبروں نے اس سے علیحدگی اس وجہ سے اختیار کر لی کہ کانگریس اپنے ابتدائی اصولوں سے ہٹ کر نئے اصولوں کی پابند ہو چکی ہے۔ ایک ماہ بعد کانگریس اپنی سنہری جوبلی منائے گی حقیقی معنوں میں خصوصاً ابتدائی معنی میں ہر محب وطن کانگریسی ہے حالانکہ اہم تبدیلیوں اور موجودہ اصولوں کو دیکھتے ہوئے ہر محب وطن کانگریس کا ممبر نہیں کہا جا سکتا تمام ملک میں احتجاج کا جذبہ پھیلا ہوا ہے جس کا دوسرا نام زندگی ہے زندگی امید ہے کوشش امید ہے اور ہر وہ کام جو بے لوث، نیک نیتی اور قربانی کے ساتھ کیا جائے اس کا کامیاب ہونا لابدی اور لازمی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ منزل دور ہو مگر قدرت ہر حالت میں معین ہو کر ایسے کام کو سر انجام کو ضرور پہونچاتی ہے اور کامیابی حاصل ہوتی ہے۔

کانگریس اور دوسری جماعتیں

آج کل کے کانگریسی اصحاب کا طرز و طریقہ ان لوگوں کے ساتھ جو ان سے اختلاف رائے رکھتے ہیں ویسا ہی ہے جس کی مثال مسٹر جے۔ اے۔ اسپنڈر نے لیبر پارٹی کا ولایت کی دوسری جماعتوں سے کرتے ہوئے پیش کی ہے۔ میں ان کے الفاظ چند سطروں میں درج ذیل کرتا ہوں:۔

"پرانے زمانے کی پارٹیاں ایک دوسرے پر بھروسہ کرتی تھیں۔ ان کا طرز و طریقہ آپس میں رواداری کا تھا۔ بعض اوقات ایک دوسرے کی اچھائیوں کو تسلیم کرتی اور کبھی کبھی اپنی بابت یہ خیال ہوتا کہ ممکن ہے کہ اپنی پارٹی کی رائے غلط ہو لیبر پارٹی کا یہ حال نہیں ہے وہ رواداری کے نام سے ناآشنا ہے اس کا رنگ روپ من کچھ الگ حرج

کے ایسا ہے کہ اپنے تمام ممبروں کو ایک بنائے، اور دوسری جماعتوں سے کسی ایک فرد کا اپنے ایک ممبر کا بھی تعلق نہ رکھنے دے اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی خیال اپنے دلوں میں قائم رکھے کہ غلطی ہو ہی نہیں سکتی۔

مسٹر برٹنیڈرسل فرماتے ہیں "جب کسی قوم کی ذہنی تحریک کسی خاص کام پر لگی ہوئی ہوتی ہے تو بعض قوموں میں اعتدال قائم نہیں رہتا اور اعصابی تخریب کی طرح حالت پیدا ہو جاتی ہے"۔

غالباً اس دنیا میں بہت سے کام بغیر سوچے سمجھے ہی نہیں ہوا کرتے بلکہ بہت سے ایسے بھی ہیں جن پر اگر خیال کیا جائے، تو ایسے ہیں جن کی بابت عقل کبھی مشورہ نہ دے.... .... ہیملٹ کی مثال ایک خوفناک تنبیہ عمل بغیر خیال کی ہے مگر اتھیلو کے بارے میں کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ بغیر خیال کے فعل کے ہے...... میرا خیال ہے کہ عمل اس حالت میں بہتر ہوتا ہے جب پوری کائنات اور انسانی تقدیر کو پیش نظر رکھ کر پیدا ہو اور جس میں روحانی جذبہ ہی نہ شامل ہو بلکہ ذاتی ارادہ بہت حد تک غالب ہو... ..... دنیا میں ایسی بہت سی ٹکڑیاں یا جماعتیں موجود ہیں جو اپنے ہی کو اچھا سمجھتی ہیں اور انسانی زندگی کو فراخ نظری سے نہیں دیکھتیں۔ جن میں سے اکثر اپنی ہٹ دھرمی پر قائم رہنا پسند کرتی ہیں اگرچہ پورے تہذیب و تمدن کا خون ہی کیوں نہ ہو جائے"۔

انفرادی اور مجموعی برائیوں پر قابو اس حالت میں حاصل ہو سکتا ہے جب کہ ذہن اور ارادے دونوں سے کام لیا جائے"۔ ارادے کا کام برائی سے بچنا یا اسے قابو میں کرنا ہے ذہن کا کام اس کا سمجھنا، اس کا دفعیہ سوچنا ہے یا جب اس سے مفر نہ ہو تو اسے خوبصورتی کے ساتھ تسلیم کرنا ہے۔ ذاتیات سے قطع نظر کر کے اور بہت فراخ نظری کے ساتھ عمل کرنے پر عقل قوت پکڑتی ہے۔ ظاہر اطور پر ایسا نظام جس میں غیر معمولی انسانی خوبیاں درکار ہوں شاذ و نادر ہی کامیاب ہو سکتے ہیں۔

اور ایسے نظام کی بُرائی بسا اوقات اس وجہ سے نہیں ظاہر ہوتی کہ اس کی بُرائیوں کے ظاہر ہونے کا موقع نہیں ملتا۔"

اُن جلد باز تعجیل پسند اور جلدی کرنے والے کا طرز و طریقہ جو دوسرے محبان وطن کو اس وجہ سے بُرا بھلا کہتے ہیں کہ ان کا ساتھ وہ نہیں دے رہے ہیں تعصب، کوتاہ نظری اور ناعاقبت اندیشی کی دلیل ہے جو محبان وطن ان جلد بازوں کا ساتھ نہیں دے رہے ہیں وہ محض اصولی اختلاف کی بنا پر ہے یہ لوگ آئینی جد و جہد کو اصولی طور پر مادر وطن کے مفاد کے لئے بہتر سمجھتے ہیں مگر ہمارے جلد باز محبان وطن تو یہ سمجھتے ہیں کہ مہاتما گاندھی کے پہلے کا زمانہ انتہائی جہالت اور تاریکی کا دَور تھا اور مہاتما جی نے بغیر کسی چیز کے جو کچھ کیا ہے وہ عمل میں آیا ہے اور انھوں نے بغیر کسی زندگی کے زندگی پیدا کر دی ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے ۔ پورے واقعات کی سطحی معلومات بھی اس امر کی شاہد ہیں کہ ایسا خیال بالکل غلط اور بچوں کا سا خیال ہے جو کچھ ہوا ہے وہ زمانہ گذشتہ کے حالات کی وجہ سے وقوع میں آیا ہے اور اگر گذشتہ حالات اور کام نہ ہوئے ہوتے تو موجودہ حالات کا وقوع میں آنا محال عقلی تھا۔

اگر مسٹر ہیوم اور دادا بھائی نوروجی نہ پیدا ہوئے ہوتے تو کانگریس ہی نہ ہوتی۔ مہاتما گاندھی کو بنی بنائی ہوئی ایک انجمن ملی جس میں وہ کود پڑے اور اپنے خیالات کے مطابق موقع کا لحاظ کرتے ہوئے انھوں نے اس کو اپنے رنگ میں ڈھال لیا ہرگز یہ انجیل کے اس فقرے کی مثال نہیں ہے جہاں کہا گیا ہے کہ قدرت نے کہا کہ روشنی ہوجا اور روشنی ہوگئی ۔ اگر رانا ڈے یا مہتا یا سریندرناتھ بنرجی یا تلک، گوکھلے اور مالوی نہ پیدا ہوتے تو کانگریس بھی نہ ہوتی جس میں گاندھی جی براج رہے ہیں ۔ محبان وطن کا یہ فرض ہے کہ وہ تاریخی واقعات کو پیش نظر رکھیں اور حالات کو تاریخ کی روشنی میں دیکھیں ۔ میرا یقین ہے کہ اگر معمولی

کانگریسی اپنا تھوڑا سا وقت گذشتہ تاریخ کے مطالعہ پر صرف کرے اور بجائے اس کے کہ وہ ان لوگوں کو جو اصولی طور پر مہاتما گاندھی کی اکثر رایوں سے اتفاق نہیں رکھتے انھیں بُرا کہنا کم کرکے اپنا تھوڑا سا وقت نکال کر کانگریس کی گذشتہ تاریخ کا مطالعہ کرے تو حالات جیسے ہیں ان سے کہیں بہتر اور برتر ضرور ہو جائیں گے۔ اسکولوں میں ہم نے ایک مثل پڑھی تھی جو یہاں قابل ذکر ہے۔ ’ہم اپنے کو اپنے باپ دادا سے زیادہ عقلمند خیال کرکے بیوقوف سمجھتے ہیں‘۔ یہی حشر ہمارا بھی ہوگا۔ جب ہماری اولادیں ہم سے زیادہ عقلمند ہوں گی۔

کانگریس کی ناعاقبت اندیشی

کانگریس میں انتہا پسندوں کی جماعت بڑھ رہی ہے اور آپس میں بے اطمینانی بھی پھیل رہی ہے۔ کانگریسی سوشلسٹ (اشتراکیت پسند) اپنے دوسرے کانگریسیوں کو اطمینان سے بیٹھنے نہیں دے رہے ہیں اور ان پر اعتماد بھی نہیں رکھتے ہیں اگرچہ ان سوشلسٹوں کی تعداد بہت کم ہے اور اس کی مثال مثل بادل کے ایک ٹکڑے کی جو آسمان پر نمایاں ہو اس وقت ہے مگر امکان ہے کہ یہی ٹکڑا بڑھ کر پورے آسمان پر چھا جائے۔ دیسی ریاستیں اور زمینداری کو ختم کرنے کی ناعاقبت اندیش تحریکیں مضرت رساں ہیں اس لئے کہ جائداد رکھنے والے قومی تحریک سے علٰحدہ ہو جائیں گے جس طرح سے کہ ہندی پبلک قرضہ کی چیخ پکار نے انگریزوں کے دلوں میں شبہے پیدا کر دئے اور نئے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ میں خواہ مخواہ "تحفظات شامل کر دئے گئے ہیں۔ ایک ایسے شخص کے خیال میں جو موجودہ کانگریس میں شامل نہیں ہے۔ یہ آپس کی پھوٹ بہت بڑی غلطی اور بے وقت کی شہنائی ہے۔ چاہئے یہ تھا کہ تمام پوری کی پوری قوت ایک طرف یعنے سوراج حاصل کرنے کے لئے صرف کی جاتی۔ بجائے اس کے کہ آئے دن نئی نئی پالیسیاں اور نئے نئے پروگرام مرتب کئے جا رہے ہیں

جن کا عمل میں لانا دشوار ہونے کے علاوہ محبان وطن میں اختلافات پیدا کر رہا ہے۔ ہمارا پہلا کام تو یہ ہونا چاہئے کہ ہم غیر ہندوستانیوں کے ہاتھوں سے نظام سلطنت چھین لیں۔ یہ نظام سلطنت کس طرح سے مختلف جماعتوں اور فرقوں کو دیا جائے گا اور یہ نظام کیسے مل جُل کر چلایا جائے گا یہ بعد میں سوچنے کی بات ہے۔

یہ خیال اصلاح پسند جماعت کا ہے اُس پر عجلت پسند طبقہ کچھ بھی غور نہیں کر رہا ہے۔ میں یہ کہوں گا کہ کانگریسی مغالطہ میں ہیں کسی عام جلسہ میں بہت سا مجمع دیکھ لینا اس امر کا مرادف نہیں ہے کہ وہ تحریک یا رائے صائب ہے جس کی مؤید اکثریت ہے۔ تائید اکثریت کے معنی یہ ہیں کہ سیاسیات میں دلچسپی لینے والے اور سیاسیات سے واقف اس کے مؤید ہوں نہ یہ کہ ایسے لوگ مؤید ہوں جنھیں سیاسیات کا لفظ بھی نہ معلوم ہو۔

اکثریت کی حکومت کی بنیاد

ہز ہولینس شری شنکر آچاریہ شری نگری والے جن سے نیاز مجھے گذشتہ مہینے میں حاصل ہوا اور جو ان چند غیر معمولی افراد میں سے ہیں جن سے میں ابھی ملا ہوں فرماتے ہیں کہ اکثریت کی حکومت کے معنے یہ ہیں کہ اکثریت کو رائے قائم کرنے کی صلاحیت بھی ہو لوگوں کی رائے "خدا کی رائے ہے" اور اتنی ہی نقصان رساں ہے جتنا کہ یہ خیال کہ بادشاہ خدا کا سایہ ہے کریمین جنگ سے پہلے کیا چیز زیادہ مشہور تھی؟ اب کیا حال ہے کیا ہم میں سے بہت سے ایسے موجود نہیں جنھوں نے یہ دیکھا ہو کہ وارسیلے کے صلح کا عوام نے کیا خیر مقدم کیا۔ آج اس صلح کی کیا گت ہے یہ امر بھی قابل لحاظ ہے ایک گھریلو مثال یہاں اور پیش کرتا ہوں ۱۹۱۶ء کے ہندو مسلم نفاق کے بارے میں اُس وقت کیا خیال تھا اور اب کیا ہے کسی سیاسی نظریہ کے مسٹر برٹینڈر رسل کا قول ہے دو وجوہ ہوتے ہیں ایک تو اس کا علمی پہلو یعنی

وہ لوگ جو اس کا تعلق گذشتہ واقعات سے دکھاتے ہیں اور اس کی وجہ انسانی ذہنیت کی ارتقا قرار دیتے ہیں۔ دوسرا پہلو اس مسئلہ کا اقتصادی اور سیاسی ہوتا ہے جو لوگوں کو اسی جبل سے اپنی جانب کھینچتا ہے اسی میں مہاتما گاندھی کے اصولوں کی کامیابی کا راز مضمر ہے۔ مسٹر رسل کہتے ہیں کہ جب کسی کی شخصی وقعت پر دھبہ لگتا ہے اور اس کی خودداری کو چوٹ پہونچتی ہے تو ایسی صورت میں وہ صحیح نہیں سوچتا۔ مہاتما گاندھی نے اپنے نان کوآپریشن کی تحریک اس وقت شروع کی جب ہماری خودداری پر کاری زخم لگا ہوا تھا۔ اسی مصنف کا مقولہ ہے بہت سے رہنما اور پیغمبر مختلف اوقات میں مختلف ہدایات پیش کرتے ہیں مگر کامیابی انھیں کو ہوتی ہے جو حالاتِ وقت کے مطابق ہو ایک دوسرے مقام پر رسل نے کہا ہے کہ سیاسیات میں ناسمجھی دو وجہوں سے ہوتی ہے ایک وجہ تو یہ ہے کہ ایسی جماعت یا ایسے افراد پیدا ہو گئے ہوں جو دنیا سے بیزار ہوں انھیں کا قول ہے کہ حب وطنی کے بخار کا باعث بعض اوقات ناسمجھی ہوتی ہے جس حرارت کا نتیجہ بے چینی اور بے اطمینانی لابدی ہے۔

انقلاب اور بغاوت کا بیج

سابق بیگم بھوپال نے لارڈ مسٹن سے کہا تھا جس کا ذکر لارڈ موصوف نے مجھ سے متعدد بار کیا وہ یہ ہے۔ بغاوت کے وجوہ عام لوگوں کی بھوک اور ان کا افلاس اور مختلف طبقوں کی بے اطمینانی ہے۔ بیگم مرحومہ ایک بڑی مدبّر عورت تھیں جنھوں نے لفٹنٹ گورنر صوبہ متحدہ کو صاف صاف بتا دیا تھا کہ برطانوی ہند میں یہ دونوں اسباب موجود ہیں۔ افلاس کے علاوہ ہندوستان کے سامنے کوئی اور زیادہ اہم مسئلہ نہیں ہے ڈیوک آف آرگل نے جو سابق وزیر ہند تھے اور بعد میں ٹوری جماعت کے ایک خاص رکن ہوئے۔ کہا ہے کہ انھیں یورپ کا افلاس تسلیم ہے مگر ہندوستانیوں میں جو بس ڈالنے والا اور تباہ کرنے والا افلاس پایا جاتا ہے اس کی کوئی دوسری مثال نہیں ہے۔ یہی رائے

دادا بھائی نوروجی کی جو اپنے وقت میں اقتصادیات کے بہت بڑے جاننے والے تھے کی بھی تھی۔ ان کا یہ خیال تھا کہ برطانیہ کی حکومت ہندوستان کے لئے سب سے زیادہ تکلیف دہ ہے۔ مسٹر جان ایڈن نے کہا ہے کہ ہندوستان سب سے زیادہ امیر ملک ہے مگر اس کے باشندے سب سے زیادہ غریب ہیں۔ مسٹر گوکھلے نے خود ولبی کمیشن کے سامنے فرمایا تھا" ہم میں سے سب سے بڑے کو بھی اس نظام سلطنت کے لئے اکثر جھکنا پڑتا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ جیسے دوسرے ملکوں کے لوگ اپنے ملک میں ہیں اسی طرح ہم بھی ہو جائیں۔ ان باتوں کے علاوہ ہند کو کبھی کبھی پنجاب کے مارشل لا کا تختۂ مشق بھی بننا پڑتا ہے اور کبھی کبھی جابرانہ قوانین کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔ مہاتما گاندھی نے اس جلتی ہوئی سیاسی زمین میں اپنی دو تحریکوں کے بیج بوئے۔ پہلا بیج نان کواپریشن کا تھا اور دوسرا سول نافرمانی کا فاقہ مست، مفلس اور قلانچ قوم کے سامنے ایک بہت بڑے روحانی عظمت کے مالک جس نے بڑی بڑی قربانیاں کر ڈالی تھیں جو مجسمۂ ایثار ہے اس کا یہ کہنا کہ تمام آلام ومصائب کے لئے اکسیر اور تمام برائیوں کا رو بس انھیں دونوں میں ہے جادو کا اثر رکھتا تھا۔ پھر کیا تھا صوبہ صوبہ شہر شہر بلکہ گھر گھر ان کی تحریکوں کی لہر دوڑ گئی بس یہی معلوم ہوا کہ ایک آگ تھی جو تمام عالم میں پھیل گئی۔

لبرل رائے

دوسری جانب لبرل جماعت ہے جو میرے خیال کے مطابق صحیح اور ملک کے حالات کے مطابق ہے مگر اس کا پھیلانے والا مہاتما گاندھی جیسا بلند مرتبہ کوئی شخص نہیں ہے۔ حالات، عادات، واقعات پر اس کی بنیاد ہے اس لئے عام مقبولیت اسے نہیں ہو سکی۔ ایک انگریز مدبر کا قول ہے کہ لبرل کو غلط اور صحیح میں امتیاز کرنا زیادہ پسند ہے بجائے اس کے کہ وہ جذبات سے مرعوب ہو جائے۔ کاش گورنمنٹ لبرل لوگوں کے کہنے کو تسلیم کرتی اور انھیں کی

رائے کے مطابق عمل کئے ہوتی تو آج زمانے کی حالت دوسری ہوئی ہوتی مگر اسے کب اس کا خیال ہے کیوں نہ ہو تحکمانہ غیر ملکی حکومت سے امید ہی کیا ہوسکتی ہے۔

گورنمنٹ کی ذمہ داری

جب میں ان مختلف اور متعدد اوقات کا خیال کرتا ہوں جس پر گورنمنٹ اپنے کو اور نیز اُن لوگوں کو جو آئینی طریقوں کے مؤید ہیں ان کو وقتی اور دانشمندانہ طریقے برت کر اور رائے عامہ کا لحاظ کر کے مناسب طریقے برتے ہوتے جب میں یہ خیال کرتا ہوں کہ تھوڑی سی نرمی زخمی دلوں پر مرہم کا کام کئے ہوتی اور جب میں اس امر کا خیال کرتا ہوں کہ تھوڑی سی ناعاقبت اندیشی کے بجائے گورنمنٹ وقتی ملائمت سے کام لیتی اور ہزاروں نئے کانگریسیوں کے ساتھ تھوڑی سی رحمدلی کا اظہار کئے ہوتی تو میں یہ خیال کرتا ہوں کہ فارسی کا وہ مشہور شاعر سچ کہہ گیا ہے "اے بیٹے دیکھ دنیا کی سلطنت کرنے کے لئے کس قدر کم عقل درکار ہے" اپنی اس ناعاقبت اندیشانہ روش سے گورنمنٹ ایک جانب غیر ممدوح ہو چکی ہے اور دوسری جانب لبرل پارٹی کی تعاونی پالیسی اسے غیر ذمہ دار قرار دیتی ہے۔ سچ ہے ایک غیر ذمہ دار غیر آئینی طرز حکومت کے زمانے میں آئین پسند پارٹی کا ممدوح ہونا محال ہے۔

لبرل جماعت کانگریس میں کیوں نہیں شریک ہوسکتی

اس وقت اکثر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ لبرل جماعت آخر کیوں اپنے پرانے طریقے پر قائم ہے اور کیوں نہیں کانگریس میں سب کی سب شریک ہوجاتی۔ اس سوال کا جواب کسی حد تک پہلے کے صفحات میں دیا جاچکا ہے۔ بہرصورت مختصراً یہاں بھی دیا جاتا ہے۔ جب لبرل جماعت ملک کی پوری حالت کا اندازہ کرتی ہے جس میں فرقہ وارانہ نا اتفاقی دھوم مچائے ہے جس میں آپس کا نفاق ضرب المثل ہے کہ اس میں اکثریت اقلیت پر زبردستی کے ساتھ

حاوی ہے یہاں فرقہ وارانہ جھگڑے پھیلے ہوئے ہیں جہاں لوگوں کو سوراج حاصل کرنے اور اس کے لئے متحدہ قوت صرف کرنے کے بجائے نفسی نفسی پڑی ہے یہاں (برطانوی پالیسی کی وجہ سے) ہم اپنے ملک کی حفاظت کرنے کے لئے بیکار ہیں جہاں ہمارے معاشرتی طریقے ہمارے قومی اتحاد اور اخلاص کے بالکل خلاف نظر آرہے ہیں تو ایسی صورت میں یہ خیال لابدی پیدا ہوتا ہے کہ حصول آزادی سے پہلے ملک کو ان تمام نقائص سے پورے طور سے پاک وصاف ہونا چاہئے اور اگر بغیر ان برائیوں کو رفع کئے ہوئے حصول آزادی کے لئے ہر طریقہ اختیار کر لیا جائے خواہ وہ کیسا ہی ہو ایسی صورت میں ملک کو بجائے فائدے کے نقصان پہونچنے کا یقین کامل ہے لبرل جماعت اسے سیاسی بے ایمانی اور ذہنی بددیانتی تصور کرتی ہے اور اپنے ضمیر کے خلاف سمجھتی ہے کہ ہر غلط و صحیح طریقہ حصول آزادی کے لئے اختیار کیا جائے۔ سچ تو یہ ہے کہ کانگریسیوں کو زیادہ رواداری اور لبرلوں کو زیادہ ایثار سے کام لینا چاہئے اور ہر جماعت اور ہر فرقہ کو وہ روش اختیار کرنی چاہئے جس سے ایک دوسرے پر آپس میں پورا پورا بھروسہ قائم ہو جائے میری تو دلی خواہش ہے کہ رچرڈ بیکسٹر کا مقولہ ہر ہندوستانی پورے طور سے یاد رکھے (مقولہ یہ ہے۔ جو ضروری باتیں ہیں ان میں اتحاد سے کام لینا چاہئے جو غیر ضروری ہیں ان میں آزاد خیالی برتنی چاہئے اور تمام باتوں میں سخاوت اور دریادلی سے کام لینا چاہئے۔

آئینی ترقی

دوسری بات جو قابل غور ہے وہ یہ ہے کہ اب ہم یہ دیکھیں کہ آیا سیاسی ترقی کے ساتھ ساتھ جو ہندوستان میں اسی دَور میں رونما ہوئی ہے۔ آئینی ترقی ہوئی ہے یا نہیں۔

میری اپنی رائے ہے کہ آئینی ترقی ہوئی ہے مگر جس حد تک اسے ہونا چاہئے تھا نہیں

ہوئی ہے ۔ ہمیں یہ معلوم ہے کہ گورنر جنرل کی ۱۸۵۴ء کی مجلس قانون ساز میں ایک بھی غیر سرکاری ممبر نہ تھا ۔ پہلا انڈین کونسل ایکٹ ۱۸۶۱ء میں پاس ہوا جس کے تحت میں چند غیر سرکاری ممبر نامزد ہوئے اس کے ۳۱ برس بعد دوسرا قدم اٹھا اور ۱۸۹۲ء میں انڈین کونسل ایکٹ دوبارہ پاس ہوا جس کے تحت میں کچھ اور حقوق ملے پھر، ۱۷ برس بعد آئینی ترقی کا دوسرا قدم اٹھا مارلے منٹو کونسل جو ۱۹۰۹ء ایکٹ کے ماتحت قائم ہوئی باوجودیکہ وہ زیادہ امید افزا نہ تھی پھر بھی پہلے کے حالات دیکھتے ہوئے کافی طور پر امید افزا تھی ۔ چوتھی قسط ۱۰ برس کے بعد آئی اور منٹیگو اصلاحات جو ہندوستان کو دئے گئے ان کو عام طور پر ناکامیاب بتایا جاتا ہے میری ذاتی رائے ہے کہ اس کے نتیجے امید سے بھی زیادہ خراب ہوئے جس کی ذمہ داری بیشتر گورنمنٹ اور کانگریس پر ہے ۔ میرا خیال واثق ہے کہ اگر نیشنل کانگریس نے کاونسلوں میں آنا مناسب سمجھا ہوتا تو نتائج اس قدر خراب نہ ہوتے محبان وطن میں ایسی صورت میں ایسا زبردست اتحاد قائم رہتا کہ ہمارے حکمرانوں کی ہمت ہمارے خلاف کام کرنے کی ہرگز نہ پڑی ہوتی ۔ یہ وہی ہمارے حکمران ہیں جنھوں نے موقع پاکر اصلاحات ۱۹۱۹ء کے بنانے والوں کے منشا اور مقصد کے خلاف سب کچھ کر ڈالا لیکن ساتھ ہی ساتھ اس کی ذمہ داری کانگریس پر بھی ہے جس نے ان ہمارے حکمرانوں کو ایسا کرنے کا موقع دیا ۔ ۱۶ برس کے بعد پانچویں قسط اصلاحات کی موجودہ ایکٹ ۱۹۳۵ء کی صورت میں ملی ہے جس کے متعلق گذشتہ صفحات میں، میں اپنی رائے کا کافی اظہار کر چکا ہوں ۔ یہ کہنا پڑتا ہے کہ ترقی کے خیالات زندہ ہیں اور سلطنت برطانیہ نے قومی تحریکوں کا اثر لے کر اپنی پالیسی میں بے اعتنائی سے کام نہیں لیا ہے ۔ گورنمنٹ برطانیہ نے سیاسی رہنماؤں کے اختلافات سے فائدہ اٹھا کر حتی المقدور موجودہ ایکٹ کو برا بنایا ہے پھر بھی میں اس میں ایک امید افزا پہلو دیکھ رہا ہوں یعنی ووٹروں کی

تعداد میں اضافہ۔ ہزاروں کی تعداد میں ووٹروں کا بڑھانا اور کاونسلوں کی تعداد ممبران کا جو ان ووٹروں کے ذریعہ سے منتخب ہوں ان میں اضافہ کرنا اور پھر ان کاونسلوں کو اصلی اختیارات سے محروم رکھنا اور ان کے ہاتھ جکڑ دینا صحیح اصلاح پسند طبقہ کی نظروں میں مستحسن و ممدوح نہیں ہو سکتا۔ بالکل یہی حال موجودہ اصلاحات ۱۹۳۵ء کا ہے۔ میری یہ پیشینگوئی ہے کہ ایسے اصلاحات سے بے اطمینانی زیادہ پھیلے گی اور سخت شورش رونما ہوگی۔

ایک نہایت اہم بات تو یہ حاصل ہوئی کہ ہندوستانیوں کو گورنمنٹ کے راز دار اور خفیہ کاونسلوں میں جگہ ملی یعنی مجلس منتظمہ میں۔ کانگریس نے صحیح طریقہ پر اس خواہش کا اظہار ۱۹۰۴ء میں سب سے پہلے کیا۔ مجلس منتظمہ کے بارے میں سب سے پہلی تجویز ۱۹۰۴ء میں پاس ہوئی۔ اگر آج اس تجویز کو پڑھو تو تمھیں پتہ چلے گا کہ ہم ترقی کی کس منزل پر ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ جب ۱۸۹۹ء میں مسٹر آر، سی، دت نے لکھنؤ میں کانگریس کی صدارت کرتے ہوئے کمیٹی میں خود ہندوستانیوں کو مجلس منتظمہ میں مقرر کئے جانے کے لئے تجویز پیش کی اور اس پر لوگوں نے یہ کہا کہ یہ بہت کچھ ہے اسے اس وقت نہیں ماننا چاہئے یہاں تک کہ مسٹر تلک ایسے شخص نے بھی اس پر زور نہیں دیا اور صدر کو تجویز واپس لینا پڑی۔

۱۹۰۲ء میں پہلے پہل انڈیا کاونسل میں مسٹر سید حسین بلگرامی اور سر کے، جی، گپتا کو جگہ ملی اس کے ڈو برس بعد وائسرائے کی مجلس منتظمہ کا سب سے پہلا ہندوستانی ممبر ہوا۔ اس کے بعد ہندوستانی مدراس، بمبئی اور بنگال میں بھی مجلس منتظمہ کے ممبر بنائے گئے۔ دارالخواص (ہاؤس آف لارڈ) نے دو بار اس قسم کی تجویز کو صوبہ متحدہ میں قائم کرنے کو مسترد کر دیا مگر آج دیکھو گورنر جنرل کی مجلس منتظمہ میں اس وقت تین ہندوستانی ممبر ہیں۔ علاوہ بریں دو مدراس اور دو بنگال میں اور ہر صوبہ میں

ایک ہندوستانی۔ ہر صوبہ میں خواہ وہ کتنا ہی چھوٹا ہو ایسی مجلس موجود ہے۔ یہی نہیں بلکہ وزرا بھی ہیں جو سب کے سب ہندوستانی ہیں۔ اس ضمن میں جو ترقیاں ہوئی ہیں ان کا منٹیگو کے زمانے سے پہلے وہم و گمان نہ تھا۔ پریوی کاونسل اور اس کی جوڈیشل کمیٹی میں بھی ہندوستانی ہیں۔ ہندوستانی ہائیکورٹ کے جج بھی ہیں سب سے پہلے جب لارڈ رپن نے سر رامیش چندر متر کو قائم مقام چیف جسٹس مقرر کیا تو ہندوستان میں بسنے والے انگریزوں کو یہ جدت بہت ناپسند ہوئی اس وقت سے متعدد ہندوستانی قائم مقام چیف جسٹس رہ چکے ہیں۔ اور دو ہندوستانی مستقل چیف جسٹس ہوے ہیں۔ ایک ہندوستانی دارالخواص کا ممبر بھی تھا اور پارلیمنٹری انڈر سکرٹیری بھی ہوا اور وہی ایک صوبہ کا گورنر بھی بنایا گیا (مترجم۔ یہ لارڈ سنہا تھے) متعدد ہندوستانی گورنری کی قائم مقامی بھی کر چکے ہیں۔ (مترجم صوبہ متحدہ میں نواب صاحب چھتاری صوبہ مدراس میں سر محمد عثمان اور صوبہ متوسط میں مسٹر راؤ وغیرہ گورنری کے قائم مقام رہ چکے ہیں)۔

غیر امید افزا پہلو

جب ہم ان ترقیوں پر نظر ڈالتے ہیں تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا نمائندگان ملک کے ہاتھوں میں حکومت بھی منتقل ہو رہی ہے اس کا جواب نفی میں پیدا ہوتا ہے۔ ہر مرتبہ دکھاوا ہی دکھاوا اور کاونسلوں کی بھڑک جو اپنے اوپر ایک زر کثیر صرف کرتی ہے ہمارے سامنے پیش ہو کر یہی بتاتی ہے کہ اصلی حکومت انگریزوں کے ہاتھوں میں قائم ہے۔ مسٹر جے، اے، اسٹینڈرج جو ایک نہایت مشہور و معروف برطانوی سیاست داں ہیں کہتے ہیں "جہاں انتظام مجلس قانون ساز کے مشورے کے بغیر ہو اور مجلس قانون ساز کے خلاف منشا ہوتا رہے وہاں سیاست دانوں کو وہ اختیار ہی نہیں حاصل ہو سکتا جو پارلیمنٹری حکومت میں ہونا چاہئے۔ انھیں کا پھر قول ہے کہ تمام نظام سلطنتوں میں مجلس منتظمہ اور مجلس قانون ساز میں چھپے ہوئے اختیارات کے حاصل کرنے کے لئے کوششیں ہوا کرتی ہیں۔ ہماری مجالس قانون ساز

ایسے ارادوں سے بالکل محروم رکھی گئی ہیں اور باتوں کو بتانا بیکار ہے۔

برطانوی پارلیمنٹ اور ہندی مجالس قانون ساز

برطانوی دارالعوام (ہاؤس آف کامنس)

اصلی حکمران ہے اور ملک میں جتنے طباع اور ذہین پیدا ہوتے ہیں ان کی یہ خواہش ضرور ہوتی ہے کہ دارالعوام کے ضرور ممبر ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ دارالعوام کی تقریروں کا منشا عملی صورت سے ملک کی سلطنت کرنا ہوتا ہے۔ بلیک اسٹون نے دارالعوام کے ممبر کے منصب کو اس طرح بتایا ہے "دارالعوام کی تشکیل ملک کے ایسے نمائندوں پر ہوتی ہے جن میں نوابین شریک نہیں ہیں کوئی ممبر باوجودیکہ وہ ایک مخصوص ٹکڑے یا ضلع سے منتخب ہوکر آتا ہے پورے ملک کی خدمت کو اپنے پیشِ نظر رکھتا ہے۔ اس کا مقصد خاص نہیں بلکہ عام ہے اور وہ تمام قلمرو کی خدمت کو اپنا فرضِ منصبی سمجھتا ہے"

اب ہمیں اپنی کاونسلوں کی تشکیل دیکھنی ہے اور یہ دیکھنا ہے کہ اس میں کیسے کیسے لوگ منتخب ہوکر تشریف لاتے ہیں۔ سب سے زیادہ دیکھنے کی جو چیز ہے وہ یہ کہ ان میں ایک درجن سے زیادہ مختلف جماعتوں اور طبقوں کے لوگ انتخاب جداگانہ کے ٹکٹ پر آتے ہیں۔ بفرضِ محال اگر دارالعوام کا انتخاب جنرل میڈیکل کاونسل، صحافت نگاروں کی انجمن، مصنفین کی انجمنوں پر مشتمل کردیا جائے تو اس کی حالت اس قدر بدتر نہ ہوگی جتنی کہ ہمارے ملک میں فرقہ وارانہ اور مختلف فوائد و حقوق کو پیشِ نظر رکھ کر مجالس قانون ساز بنائی جاتی ہے۔ ہماری کاونسلوں کو محض یہی شرف نہیں حاصل ہے کہ ان میں زمیندار انجمن، تجار کی انجمن اور نیز دیگر ایسی مختلف جماعتوں کے نمائندے شامل ہیں بلکہ اس کو یہ بھی شرف حاصل ہے کہ ان میں مختلف مذاہب فرقہ و طبقہ کے افراد مع اپنے اپنے راگ اور اپنی اپنی بانسری کے آتے ہیں۔ مثلاً مسلمان، یوروپین، اینگلو انڈین، سکھ، انڈین کرسچین نیچ ذات

اور عورتوں کے نمائندے۔

انگلینڈ میں چونکہ پارلیمنٹ ہی اصلی حکمراں ہے اس لئے کوئی شخص اعلیٰ شہرت نہیں حاصل کرسکتا تاوقتیکہ وہ پارلیمنٹ کا اچھا ممبر نہ ہو۔ امریکہ میں کانگریس کی ممبری سے چنداں زیادہ فائدہ نہیں ہوتا تاوقتیکہ کانگریس میں رہ کر باہر اُس کے اثرات نہ ہوں۔ امریکہ میں جمہوری سلطنت صدر کے ذریعہ سے عمل پیرا ہے یہ صدر انتظامات کا ذمہ دار ہوتا ہے اور ہمیشہ منتخب شدہ شخص ہوتا ہے۔ ہماری کاونسلیں رشتاگ (جرمن کونسل) سے بہت کچھ مشابہ ہیں۔ جن کے بارے میں کہا گیا ہے کہ جمہوریت کا تو صرف نام ہے مگر یہ جابرانہ طرز حکومت کے عیوب پر ایک نقاب ڈالے ہیں۔ اسی رشتاگ کے بارے میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان میں تین درجن تو ہوشیار اور ذی فہم ہوتے ہیں اور ۳۵۰ ایسے ہوتے ہیں جو ترقی کے خیال سے بھی ناآشنا ہیں۔ ایسی صورت میں یہ کوئی تعجب خیز امر نہیں کہ ہمارے ایم، ال، اے اور ایم، ال، سی اس قابل نہیں کہ جنھیں گورنمنٹ اختیارات دینا مناسب سمجھے۔ یہ بھی کوئی بعید نہیں کہ موجودہ الکشن میں باوجود ووٹوں کے اضافہ ہونے کے ممبران کی نمائندگی کی حیثیت میں کمی ہوجائے اور اختیارات و حکمرانی محض چند اشخاص کے ہاتھ میں چلی آئے۔ میری رائے ہے کہ چند ہندوستانیوں کے ہاتھ میں حکمرانی کا آنا غیر ملک کے ہاتھوں میں اس کے رہنے سے کہیں بہتر ہے یہ بھی خیال کرنا چاہئے کہ ہاوس آف کامنس کو جو اب نمائندگی کی حیثیت حاصل ہے وہ پہلے نہیں تھی۔ یہ حیثیت بہت دنوں اور بہت کوششوں کے ساتھ حاصل ہوئی ہے۔ ان کے اصلاحات ۱۸۳۲ء، ۱۸۶۷ء، ۱۸۸۴ء اور ۱۹۱۸ء قابل غور ہیں جن کی وجہ سے اسے موجودہ حالت نصیب ہوئی ورنہ پہلے جو رنگ تھا وہ ذیل کے الفاظ سے ظاہر ہوگا۔ "گذشتہ زمانے میں سیاست دانوں کی محض فائدہ اُٹھانے کے وقت ضرورت محسوس کی جاتی تھی۔ ان میں سے اکثریت کا تعلق

اپنے کسی نہ کسی آقا یا سرپرست کے ساتھ تھا مثلاً بڈفورڈ - بیوٹ یا بکنگھم کے دامن دولت سے وابستہ ہوتے اور انھیں کے چشم و ابرو کے اشارے پر اپنے ووٹ پیش کرتے - اُن افراد کے مربی بھی چاہتے کہ سیاسیات سے یہ لوگ جس قدر کم اپنی ذاتی رائے کا تصرف کریں اچھا ہے - تین چوتھائی دارالعوام کے ممبر تو ایسی جگہوں کے ممبر ہو کر آتے تھے جو ملی ہوئی ہوتی تھیں اور جن کے مالک کچھ خاص لوگ ہوتے تھے یا نیلام خریدنے والے ہوتے - انتخابات کا جو طریقہ تھا وہ تین سو برس پیچھے کا دقیانوسی طریقہ تھا ٹیوڈار نے اس میں ترمیم کی - اولڈ فیلڈ کہتا ہے کہ ۱۸۱۵ء میں دارالعوام کے ۱۷، ۴ ممبر تھے جو ۱۴۴ نوابوں کے چشم و ابرو پر منتخب ہوئے اور جن میں سے صرف ۱۷۱ عوام کے ووٹ سے منتخب ہوئے اور محض یہی ایسے مقامات سے آئے جہاں نوابوں کے اثرات کم تھے اور جو اپنے ووٹ کو کم بیچتے تھے۔ اس وقت صرف ۱۶۵۰۰۰ ووٹر تھے "

انگلستان کی وزارت کی ساخت

وزارت کی ساخت میں پارلیامنٹ کی کیا ذمہ داری ہے ؟ اکثر سیاسی سوانح عمریوں میں ایسی مثالیں ملتی ہیں جس سے پارلیامنٹ کی ذمہ داری کا دُور سے لگاؤ بھی نہیں ملتا جن کی چند مثالیں درج ذیل ہیں - ڈسرائیلی نے وزارت کے ممبروں کے چنتے وقت ایک شخص کو تجارت کی وزارت کے لئے یہ کہہ کر چنا حالانکہ وہ لوکل بورڈ سے زیادہ واقف تھا - " کوئی مضائقہ نہیں - میرا خیال ہے کہ تم تجارت سے اسی حد تک واقف ہو جتنا کہ جہازرانی کے اصولوں سے اس کا سب سے بڑا افسر " ریچارڈ لیک شل سے دریافت کیا گیا کہ اسے وزیر تجارت کے لئے کیوں لیا گیا تو اُس نے کہا کہ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ تجارت کے اصول سے وہ بہت کم واقف ہے " جان برائٹ جو تجارت کے بورڈ کے صدر مقرر کئے گئے تھے اس کے انتظامی

معاملات سے اس قدر ناواقف تھے کہ سرکاری کاغذات میں نشانات رکھنا اور مسل کو ترتیب دینا بھی نہیں آتا تھا۔

پامرسٹن نے سر جارج کارنوال لوئی کو وزارت جنگ کے لئے منتخب کیا اور لیڈی تھرسالوئی سے اس کے متعلق اس طرح سے کہا۔ "ان کے فرائض فوجی نہیں بلکہ انتظامی ہوں گے اور ان کو صرف حسابات فوجی کی جانچ کرنی ہوگی" اس لیڈی نے جواب دیا کہ وہ اپنے حساب کی دیکھ بھال تو کر ہی نہیں سکتے۔" وزیر نے کہا کہ یہ بھی نہیں محض توشے خانے کی دیکھ بھال کرنی ہوگی۔ لیڈی نے جواب دیا کہ ان سے تو یہ بھی نہیں ہو سکتا۔ اگر میری لڑکیاں ان کے درزی سے کوٹ کے لئے نہ کہیں تو کوٹ بھی نہ بنے آخر کارلوئی نے وزارت قبول کرلی اور کام شروع کر دیا۔

ایک مرتبہ نوآبادیات کے سکریٹری کی جگہ کے لئے تلاش ہوئی کوئی معزز شخص نہ ملتا تھا۔ پامرسٹن نے یہ کہا کہ اس جگہ کو میں خود لوں گا اور پریوی کونسل کے کلرک کو بلا کر کہا کہ ذرا چند منٹ کے لئے اوپر آؤ اور نقشے پر یہ جگہیں مجھے بتادو۔

چارلس جمیس فاکس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انھیں کنسول (CONSOLE) کے معنی نہیں معلوم تھے اور اخبارات سے وہ صرف اس قدر سمجھ سکتے تھے کہ کنسول کوئی ایسی چیز ہے کہ جس میں تنزلی و ترقی ہو سکتی ہے۔ اور جب اس میں تنزلی ہوتی تو پٹ (P.T) کو اس پر گھبراہٹ ہوتی تھی فاکس خوش ہوتا۔

لارڈ رین ڈالف چرچل کے بارے میں خود ان کا لڑکا لکھتا ہے کہ جب وقت لارڈ موصوف وزیر مالیات تھے اور بجٹ ان کے سامنے پیش ہوتا تو اعشاریہ کے اعداد کے بارے میں وہ دریافت کرتے کہ یہ کیا بلا ہے۔

سر ایڈورڈ کارسن جو ۱۹۱۷ء میں امیر البحر تھے خود کہا ہے کہ جب وہ اس محکمہ میں ملازم ہوئے تو ان کو کچھ نہ معلوم تھا۔ وہ خود کہتے ہیں کہ جب میں پہلے دن

ملازم ہوا تو مجھ سے کسی نے میری معلومات کے بارے میں دریافت کیا۔ میں نے جواب دیا کہ بس اتنا ہی جانتا ہوں کہ میں سمندر میں ہوں۔

چارلس ڈکنس مشہور انگریزی ناول نگار نے گورنمنٹ کی ساخت کے بارے میں اس طرح مذاق اڑایا ہے: "چونکہ ڈیوک آف فاڈل کی گوڈل سے نہیں پٹتی اس لئے اب بادشاہ کو لارڈ کوڈل اور سر ٹامس ڈوڈل پر وزارت تقسیم کرنی ہے اس لئے کہ ہوڈل کا جھگڑا ہے اگر وطنی محکمہ کو جوڈل کے سپرد کیا جائے اور خزانے کوڈل کو۔ نوآبادیات لوڈل کو اور بیرونجات موڈل کو تو پھر نوڈل کو کیا ملے گا۔ اس لئے کہ کونسل کی صدارت گو پوڈل کو دی جائے گی۔ جنگلات کوڈل کے لئے مناسب نہیں اور اگر لوڈل کو کچھ نہ ملے تو ملک کی تباہی یقینی ہے۔

یہ ایک قابل لحاظ امر ہے کہ وزارت کی ساخت میں جو ترمیم ضروری ہے اور دار العوام کو اس میں حق حاصل ہے اس پر غور نہیں کیا گیا۔ یہی نہیں کہ اکثر ہم یہ جانتے ہوئے کہ ہماری رائے ٹھیک نہیں ہے کہہ ڈالتے بلکہ ایک اور بھی خرابی اکثر رونما ہوتی ہے جس کا اظہار مسٹر اسپنڈر کے اس جملہ سے بخوبی ہوتا ہے "بعض ممالک میں گورنمنٹ خود مختار رائے کے اظہار سے روکنے کے لئے لوگوں کو اسناد و خطابات دے کر اپنے قبضہ میں کر لیتی ہے" وہی مصنف آگے چل کر کہتا ہے کہ یہ ضرور ہے کہ اکثر تقریریں ہماری کونسلوں میں بلند پایہ ہوتی ہیں مگر بیشتر تو ایسی روکھی پھیکی اور بے موقع و بے محل ہوتی ہیں کہ طبیعت اُکتا جاتی ہے۔"

مطابع پر قیود قوموں کی سیاسی آزادی کی روک تھام کے لئے مطابع کے قیود خاص اہمیت رکھتے ہیں جن کے متعلق پہلے ذکر کیا جا چکا ہے۔ متمدن و مہذب گورنمنٹ کا فرض ہے کہ متمدن قوم کے لوگوں کے لئے آزادی رائے اور آزادی تقریر اسی قدر ضروری و لابدی سمجھے جس قدر کہ ان قوموں کے جان

اور مال کی حفاظت اس کا فرض ہے - اور اس پر اگر کچھ قیود عائد کئے جائیں تو انتہائی ضرورت کے وقت اور کم سے کم زمانے کے لئے - مگر اس کا خیال ہرگز نہیں رکھا گیا اور مختلف اوقات و حالتوں میں ان قیود نے نئے نئے روپ بدلے خصوصاً قانون بغاوت ۱۸۹۰ء - قانون مطابع ۱۹۱۰ء - قانون تحفظ والیان ریاست ۱۹۲۲ء و ۱۹۳۴ء - پریس آرڈیننس ۱۹۳۰ء و ۱۹۳۲ء - کرمنل لا امنڈمنٹ ایکٹ و اسپشل پاورس ایکٹ ۱۹۳۱ء و ۱۹۳۲ء و ۱۹۳۵ء کی شکل میں یہی نہیں بلکہ کچھ نئے نئے سخت قیود مطابع کے متعلق اور عائد کئے گئے ہیں اور حکام کو کچھ خاص اختیارات مطابع کے متعلق گورنمنٹ نے کئی صوبوں کی حکومتوں کو پانچ برس کے لئے اس سال اور دے ہیں - یہ یقین کے ساتھ اب کہا جا سکتا ہے کہ جو نظام کہ آنے والا ہے محض اس میں گورے چمڑے والوں کو محفوظ رکھنے کی غرض سے یہ پیشبندی کی جاری ہے اس لئے کہ وزارت خواہ کسی کے ہاتھ میں جائے اصلی اختیارات تو گورے چمڑے والوں کو حاصل رہیں گے - ایک مشہور و معروف اخبار کے مالک کا جو بھی مفہوم اس جملہ سے رہا ہو کہ "مطابع کی رائے وہی ہو"

میں ذیل میں ایک شہرہ آفاق اور تجربہ کار مدبر کی رائے نقل کرتا ہوں "موجودہ دَور میں جمہوری سلطنت کے لئے مطابع و اخبار اشد ضروری ہیں - مطابع و اخبار کے لئے سیاست ضروری نہیں ہے مگر سیاسیات تو بغیر مطابع و اخبارات کے زندہ ہی نہیں رہ سکتیں لطف تو یہ ہے کہ اخبارات کی نظروں میں خود گورنمنٹ نے سب سے زیادہ مورد الزام اپنے کو قرار دیا ہے اور اگر گورنمنٹ اپنے اختیارات کا اضافہ کرکے زیادہ قیود پریس پر عائد کرے گی تو اپنے حقیقی نفاذ کی موت ان میں مضمر ہوگی اور پھر جمہوریت کے محاسن فنا ہو جائیں گے - یہ بات خاص طور پر قابل غور ہے کہ ایک جانب تو پبلک نے نہایت مشقت برداشت کرکے صحافت کو ہندوستان میں فروغ دیا ہے

اور دوسری جانب گورنمنٹ مطابع و اخبارات پر نت نئے قیود عائد کرتی رہتی ہے۔

حقیقت و مجاز

جو کچھ میں نے بیان کیا ہے اس سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ باوجود گورنمنٹ کے اس دعوے کے کہ بہت کچھ رعایتیں سلطنت برطانیہ اور پارلیامنٹ ہندوستان کو برابر دے رہی ہے یہ بالکل درست ہے کہ اصلی اختیارات ہرگز ہرگز نہیں دینا چاہتی۔ ہندوستانی اب بخوبی واقف ہوگئے ہیں انھیں حقیقت و مجاز کی پوری پہچان ہوگئی ہے۔ ہماری اقتصادی حالت اب اس قدر گر گئی ہے اور سیاسی رائے میں ایک انقلاب عظیم پیدا ہوگیا ہے کہ اصلاحات کی قدر اسی وقت اب ہم کریں گے جبکہ اصلی اختیارات اصلاحات کے تحت میں ہمیں نصیب ہوں۔

انتظامی معاملات میں

انتظامی معاملات میں بعض بعض جانب کچھ ترقی ہوئی ہے اور سب سے بڑی اصلاح تو بڑی بڑی اسامیوں پر ہندوستانیوں کا تقرر ہے۔ فوج کے محکمہ میں دو اصلاحیں خاص طور پر قابل لحاظ ہیں۔ ایک تو ذاتوں کے قیود کو نکال دینا اور دوسرا ہندوستانیوں کا کنگ کمیشن پر تقرر۔ سول سروس میں بھی ہندوستانیوں کو جگہیں مل رہی ہیں۔ اور ہندوستان میں اس کا امتحان اب ہوتا ہے۔ علاوہ بریں ہندوستانی آئی، سی، ایس (سول سروس) کے امتحان میں جو لندن میں ہوتا ہے شریک ہوسکتے ہیں مگر لندن والے امتحان میں یہ ضروری نہیں ہے کہ جتنے ہندوستانی وہاں پاس ہوں انھیں ضرور جگہ مل جاوے بلکہ اس کے برخلاف وزیر ہند کو حال میں یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ جتنے ہندوستانی طلبہ کو چاہے بغیر امتیاز نتیجۂ امتحان لے سکتا ہے۔ ۱۹۲۳ء کے لی کمیشن کے بموجب آل انڈیا ملازمتوں پر خاص نظر عنایت ہوتی رہے گی حالانکہ اس کمیشن کی کوئی ضرورت نہیں تھی مگر اس میں کوئی کلام نہیں کہ بحیثیت مجموعی

ہندوستانیوں کو ملازمتوں میں ترقی دی جارہی ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ جس قدر ہم کو ملی ہیں ان سے کہیں زیادہ کی ہم کو ضرورت ہے اور کہیں زیادہ کے ہم مستحق ہیں محکمہ دیوانی کا فوجداری کے محکمہ سے علٰحدہ کرنا آئندہ کا ضروری معاملہ ہے۔ (کانگریس وزارت اسکی علٰحدگی کی کوشش کررہی ہے اور تجربہ کے طور پر کچھ کام بھی شروع کردیا گیا ہے۔ مترجم) یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے کہ جہاں انتظامی معاملات فوجداری کے سپرد ہوں گے غلطی کا ہونا لابدی ہے۔ مگر یہ بھی صحیح ہے کہ نہ تو یہ کہنا بالکل درست ہے کہ کچھ بھی ترقی نہیں ہوئی اور نہ یہ کہ بہت ہی زیادہ ترقی ہوئی ہے۔

محکمہ لوکل سلف گورنمنٹ میں ضرور ترقیاں ہوئی ہیں۔ ایک نسل پہلے کے مقابلہ میں اس وقت ہمارے میونسپل بورڈوں و ڈسٹرکٹ بورڈوں نے بہت زیادہ اختیارات حاصل کرلئے ہیں۔ کاشتکاروں کو بھی زیادہ حقوق ملے ہیں پھر بھی جس قدر ان کے حقوق ہونے چاہئیں نہیں ملے ہیں جس کی جانب خاص توجہ ہونی چاہئے مگر ساتھ ہی ساتھ زمینداروں کی بیخکنی نہ ہونی چاہئے جیساکہ مدراس اسٹیٹ لینڈ ایکٹ سے ہورہا ہے۔ میں کسانوں کے لئے ایسے قانون کی توقع کرتا ہوں کہ جس کے تحت میں زمینداروں کیلئے ان کے مناسب حقوق قائم رہیں اور کاشتکاروں کے ساتھ کوئی زیادتی کا ہونا ناممکن ہوجائے اور وہ آرام وچین کی زندگی بسر کرسکیں متعدد یونیورسٹیوں کا وجود جن کی جگہیں اور جن کے حدود مقرر ہوچکے ہیں ایک نہایت قابل قدر ترقی کی مثال ہے خصوصاً ایسی یونیورسٹیوں کا وجود جن کے نصاب کے لئے مخصوص جگہیں منتخب ہوسکی ہیں اور وہ ٹیچنگ یونیورسٹی کہی جاتی ہیں۔ میری تقریر اس وقت اندھرا یونیورسٹی کے تحت میں ہورہی ہے اور میں بحیثیت ایک ہندوستانی اور نیز بحیثیت ایک اسی ضلع کے باشندے کے اس یونیورسٹی کے لئے ایک درخشاں مستقبل کا خواستگار ہوں۔ اندھرا یونیورسٹی کو اس بات کا فخر حاصل ہے کہ اس کا

وائس چانسلر اندھرا کے باشندوں میں سب سے فاضل سب سے کامل سب سے ذہین مشہور شخص جو اس وقت کہا جا سکتا ہے اور موجود ہے مقرر ہوا ہے۔ یہ بالکل سچ ہے کہ سر رادھا کرشن نے اپنی قابلیت کی وجہ سے بین الاقوامی شہرت حاصل کی ہے جس پر ہندوستان کو فخر ہے۔ تحقیق نے اس زمانے میں بہت ترقی حاصل کر لی ہے اور اس میں کوئی کلام نہیں کہ ہندوستان میں چند ایسے محقق موجود ہیں جو ملک کی عظمت اور اپنی قابلیت کا چہار دانگ عالم میں ڈنکا بجا رہے ہیں۔

میں نے اب تک ہندوستانی ریاستوں کے نظام کے متعلق کسی خوبی کا اظہار نہیں کیا ہے۔ اب یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ان میں سے بعض کے نظام بہت اچھے ہیں اور ان میں بہت کچھ آئینی ترقیاں بھی ہوئی ہیں۔ کوئی یہ نہیں بتا سکتا کہ میسور، ٹراونکور، کوچن، گوالیار، اندور، بھوپال، بڑودا، بیکانیر، گونڈل اور بھاؤنگر کا انتظام معقول نہیں ہے۔ ہند کے لئے وہ نہایت مبارک دن ہوگا جبکہ تمام دیسی ریاستوں کا انتظام ریاست میسور ایسا ہوگا۔

آیندہ کی امید اگر اس کتاب کے پڑھنے والے کے دل میں ناامیدی کے تاثرات پیدا ہوں تو میری محنت رائگاں گئی۔ اس $\frac{3}{4}$ صدی کے حالات کے مطالعہ کا جو نتیجہ میں نکالتا ہوں وہ تو آیندہ کے لئے بہت زیادہ امیدیں دلا رہا ہے۔ یہ تمام حالات و واقعات تو یہ سبق ہندوستان کے لڑکے اور لڑکیوں کو دے رہے ہیں کہ انھیں جی توڑ کوشش کرنی چاہئے اور منزل مقصود کے پہونچنے میں جس قدر بھی ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑے آخر میں کامیابی لابدی ہے اور مستقبل ضرور درخشاں ہے۔ وہ لوگ جو سطحی نظریں نہیں رکھتے اور جو معاملہ فہم دل و دماغ رکھتے ہیں نہ تو بہت زیادہ مایوس ہی ہو سکتے ہیں اور نہ بہت زیادہ امیدیں ہی کر سکتے ہیں کہ ہماری قومی جد و جہد ضرور

کامیاب ہوگی ۔ یاد رہے کہ کانگریس کے مشہور و معروف مقرر نے نہ تو گذشتہ باتوں کو بہت زیادہ بتایا ہے اور نہ موجودہ حالتوں کو مایوس کن تصور کیا ہے بلکہ مستقبل کے لئے نہایت امید افزا باتوں کے امکان کی طرف توجہ دلائی ہے ۔

لارڈ لوتھین کا قول ہے کہ جمہوریت کا اصلی مقصد محاسن اخلاق کو اپنا ہادی بنانا چاہئے اور لوگوں کو جمہوریت کی بقا کے لئے اصول اخلاق کو قائم رکھنا چاہیے اس لئے کہ غضب و غلبہ نفرت و دشمنی سے جمہوریت فنا ہوجاتی ہے اور امن و امان قائم نہیں رہ سکتا ۔ وہی مصنف آگے چل کر اصول اخلاق کے بارے میں کہ وہ سیاسی زندگی میں کس طرح کارکن ہے یوں بتاتا ہے ۔

"سیاسی زندگی میں اصول اخلاق کس طرح کارکن ہے اس کا بتانا آسان بات نہیں ہے ۔ مثلاً نہایت بے لوثی کے ساتھ ساتھ دینا اور کسی حالت میں مرعوب نہ ہونا چاہئے ۔ نہایت بیباکانہ طور پر موجودہ حالات و واقعات کا مقابلہ کرنا اور ان پر عمل کرنا چاہئے نہ کہ اپنے ذاتی خیالات کے خلاف جو باتیں ہیں ان کو حقیر تصور کرنا چاہئے ۔ عام لوگوں کی بھلائی کو اپنے ذاتی مفاد پر خواہ جگہ کے لئے ہو خواہ کسی عہدہ وغیرہ کے لئے ہو ترجیح نہ دینا چاہئے ۔ اپنا ارادہ مستقل کرکے وہی کرنا چاہئے جسے اپنی طبیعت صحیح بتائے نہ کہ وہ باتیں کرے جسے عوام غلطی سے اچھا سمجھیں یا پسند کریں ۔ ساتھ ہی ساتھ یہ جذبہ بھی ہو کہ تم بعض اوقات انھیں لوگوں سے اپنی برائیاں سننے اور ان کو ناخوش کرکے نتائج برداشت کرنے کے لئے تیار رہو جن کی خدمت کرنا تم نے اپنا شعار بنا رکھا ہے ۔ دانشمندی، بے لوثی کے ساتھ ایثار ۔ اپنے اوپر پورا قابو جسے بردباری کہہ سکتے ہیں ۔ یہی اصول ہیں نہ کہ دباؤ اور حرص ہو سکتے ہیں ۔ تعلیم کی روشنی کا عام طور پر پھیلنا ۔ خدمت خلق کے جذبہ کا زیادہ سے زیادہ دلوں میں جاگزیں ہونا

لیڈر میں تدبر اور ماننے والوں میں تنظیم - ایثار - متعدد اور مختلف قوموں کو اتحاد کے ذریعے سے یگانہ بنانا - ان میں اتحاد قائم رکھنا - ذاتوں کی تفریق پر ایک دوسرے سے علیحدہ نہ سمجھنا اور قدرت پر اعتماد رکھنا - یہی باتیں ہندوستان کو منزل مقصود تک پہونچانے میں سرعت کے ساتھ معین ہیں یہی باتیں ہماری مادرِ وطن کو دوسری قوموں کی نظروں میں بلند کر سکتی ہیں اور وید و ویدانت کی سرزمین کہے جانے کا مستحق بنا سکتی ہیں - خداوند کریم ہند پر اپنا فضل کرے - میں اس دعا کے ساتھ اب ختم کرتا ہوں -

